حالاتِ حاضرہ
اور مسلمان
جماعت اسلامی ہند دھلی

حالات حاضرہ

اور

مسلمان

از

مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی

امیر جماعت اسلامی ہند

ناشر

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی ۶

بار اول دو ہزار

اکتوبر ۱۹۶۶ء

قیمت ساٹھ پیسے

مطبوعہ

جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد دہلی ۶

پیش لفظ

مسلمانان ہند کی پچھلی نصف صدی کی تاریخ کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حرکت و جمود کی دو انتہاؤں کے بیچ میں جھولتی رہی ہے جہاں ان کی حرکت بے پناہ رہی ہے وہیں ان کا جمود بھی اپنی انتہا تک پہونچتا رہا ہے۔

عمل اور رد عمل کے اس جھولے میں جھولنے والے اب پھر اپنی آنکھیں کھول رہے ہیں اور ان کا جمود پھر ٹوٹ رہا ہے۔

محترم امیر جماعت نے آئندہ صفحات میں مسلمانوں کی تاریخ کے اس پس منظر کو پیش نگاہ رکھ کر ایک طرف حالات کا بر وقت تجزیہ کیا ہے اور دوسری طرف کوشش فرمائی ہے کہ ان کی حرکت و عمل کا رخ صحیح سمت میں اور پورے توازن و اعتدال کے ساتھ متعین ہو۔

یہ مضمون اگست ۶۶ء میں سہ روزہ دعوت کے کئی شماروں میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ مضمون بظاہر تین مختلف عنوانوں پر مشتمل ہے لیکن فی الاصل یہ ایک ہی عنوان کے مختلف ابواب ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ اشارات انشاء اللہ چلنے والوں کے لئے اچھی زادِ راہ کا کام دیں گے۔

ناشر

بارالہا!

ہم کو اپنا خوف دے جو ہمارے اور گناہوں کے بیچ میں حائل ہو جائے۔
اور طاعت کی توفیق بخش جو ہم کو تیری جنت کا مستحق بنا سکے۔
اور ہمیں اتنا یقین عطا فرما جو ہم پر دنیا کی مصیبتوں کو آسان کر دے۔
اور ہم کو اپنی سماعتوں اپنی بصارتوں اور قوتوں سے زندگی بھر فائدہ اٹھانے کا موقع دے۔
اور اس نفع کو ہمیشہ باقی رکھ۔
بارالہا! ہمارے غصہ کو اس اس شخص تک محدود رکھ جس نے ہم پر ظلم کیا۔
اور ہماری اس شخص کے مقابلے میں مدد کر اور نصرت عطا فرما جو ہم سے دشمنی رکھے۔

ہمیں دین کی مصیبتوں میں مبتلا نہ کر، نہ دنیا کو ہماری فکروں کا مرکز قرار دے اور نہ ہمارے مبلغ علم کو ہمارا مطمح نظر بنا۔
اے اللہ ان لوگوں کو ہم پر مسلط نہ کر جو رحم کرنے والے نہ ہوں۔

(ترمذی شریف)

ملک کدھر جا رہا ہے؟

آئندہ انتخابات اور بدلتے ہوئے حالات

ایک جائزہ

جمہوری شعور کی بیداری

ہندوستان کا چوتھا جنرل الیکشن جوں جوں قریب آتا جا رہا ہے ملک میں الیکشن کی ہماہمی بھی تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔

گذشتہ ۲ دو جنرل الیکشنوں تک تو عام پبلک کو الیکشن سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہو سکی تھی جس کا خاص باعث یہ رہا ہے کہ یہاں آزادی کے ساتھ ہی بالغ رائے دہندگی کا اصول تو نافذ کر دیا گیا لیکن رائے دہندگان کی اکثریت اپنی ناخواندگی اور پس ماندگی کی بنا پر یہ سمجھنے کی بھی بہت کم صلاحیت رکھتی تھی کہ اس اصول کے مضمرات کیا ہیں اور اس کے نفاذ کے ساتھ وہ کتنی بڑی طاقت یا ذمہ داریوں کے حامل بنا دیئے گئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اتنے دنوں بعد بھی یہ کمی ابھی رفع نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ پچھلے الیکشنوں کی بدولت ان کے شعور میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور اب وہ پہلے سے زیادہ اپنے ووٹوں

کی قدر وقیمت پہچاننے لگے ہیں اور چونکہ گذشتہ چند سالوں میں ان کی توقعات کے برعکس نہ صرف یہ کہ آسانیاں اور سہولتیں میسر نہیں ہوئیں بلکہ اپنی روزمرہ کی زندگیوں میں انھیں سخت ترین حالات اور دشواریوں سے بھی دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اس لئے وہ اس بات کے لئے کچھ مجبور سے ہو گئے ہیں کہ اپنے حال و مستقبل پر کچھ اپنے طور سے بھی سوچ بچار کریں، اور الیکشن میں اپنے ووٹ زیادہ بہتر طور پر استعمال کر کے حالات کو زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ ان کے شعور و احساس کی یہ تبدیلی اس شکل میں نمایاں ہو رہی ہے کہ جا بجا پارٹیوں پر تبصرے ہو رہے ہیں، ان کی خوبیاں اور کمزوریاں زیر بحث لائی جا رہی ہیں، مستقبل کے بارے میں اندازے قائم کئے جا رہے ہیں اور ان میں سے کسی کو گرانے اور کسی کو اٹھانے کی بھی بات چیت چل رہی ہے۔ البتہ اس کے ساتھ ایک خاص بات یہ بھی دیکھنے میں آ رہی ہے کہ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ووٹوں کی قدر وقیمت کا تو پورا احساس رکھتے ہیں اور حالات کے بگاڑ کے مختلف پہلو بھی ان کے سامنے ہیں، اور ان کی اصلاح کا پورا جذبہ بھی، لیکن پھر بھی الیکشن کے سارے ہنگامہ کو وہ محض ایک تماشہ سمجھتے ہیں اور بظاہر اس سے وہ کسی خیر کی توقع نہیں رکھتے۔ یہ اور بات ہے کہ الیکشن کے آنے پر وہ بھی دوسروں کے ساتھ شریک ہو جائیں اور اپنا ووٹ بھی کسی نہ کسی شکل میں استعمال کر ڈالیں۔ اس طرح کے لوگ بسوں اور ریلوں کے سفر میں ہر جگہ مل سکتے ہیں، اور ان کی بات چیت سے ان کے اس رجحان کا بآسانی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ جسے ممکن ہے آپ ان کے شعور و بیداری کی کمی کا نتیجہ سمجھیں لیکن ہمارے اپنے خیال میں تو یہ ان کے شعور و بیداری کے ارتقاء کی ایک علامت ہے۔

الیکشن کی اہمیت اور سیاسی پارٹیاں

جہاں تک ملک کی سیاسی پارٹیوں کا تعلق ہے ان کو پہلے ہی سے اس کا بخوبی اندازہ تھا کہ جمہوری نظام میں الیکشن کی اہمیت کیا ہے اور ملکی نظم و نسق اور حالات میں اچھے

بڑے انقلاب اور تبدیلی کا دامن کس طرح الیکشن سے بندھا ہوا ہے اور جب آزادی کے بعد بالغ رائے دہندگی کا اصول نافذ کیا گیا تو انھیں یہ اندازہ کرنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ جمہوریت کے اس اصول کا عملی نفاذ کتنے دور رس نتائج کا حامل ہے۔ چنانچہ پہلے جنرل الیکشن کی آمد آمد سے پہلے ہر پارٹی نے الیکشن میں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی تیاریاں شد و مد سے شروع کر دی تھیں اور اس کی آمد پر وہ اس طرح میدان میں اتریں کہ اپنی کامیابی کا کوئی موقع بھی انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور اپنے مخالفین کو جس طرح بھی شکست دی جا سکتی تھی اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور پھر یہی صورت بعد کے دوسرے اور تیسرے الیکشنوں کے موقع پر بھی پیش آتی رہی۔ اور اب جبکہ چوتھا الیکشن سر پر آگیا ہے وہی نقشہ پھر سامنے ہے البتہ ایک دو باتوں میں یہ پہلے سے بہت کچھ مختلف ہے۔

اپوزیشن کی دشواریاں

(۱) ملک میں ایسی پارٹیاں ایک دو ہی ہیں جو یہ خواب دیکھ سکتی ہوں کہ وہ اب یا مستقبل قریب میں کانگریس کو شکست دیکر اقتدار پر قابض ہو سکتی ہیں۔ بقیہ پارٹیاں اپنے لیے بس اسے غنیمت سمجھتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کر کے حکومت پر زیادہ سے زیادہ اثر ڈال سکیں۔ لیکن پچھلے تین الیکشنوں کے نتائج نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی کی آرزو کا پورا ہونا کوئی آسان بات نہیں ہے اور اس کے کھلے ہوئے وجوہ ہیں۔

کانگریس جنگ آزادی میں سب سے پیش پیش رہی ہے بلکہ بہتوں کے ذہن پر یہ نقش قائم ہے کہ کانگریس ہی نے انگریزوں کو ملک بدر کیا ہے اور اسی کے طفیل میں ہمیں آزادی نصیب ہوئی ہے۔

کانگریس کے ساتھ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو جیسی عظیم شخصیتوں کی یادیں وابستہ ہیں۔ کانگریس کا نام آتے ہی یہ شخصیتیں سطح ذہن پر ابھر آتی ہیں اور یہاں کے مخصوص شخصیت پرستانہ ماحول میں بہتوں کے سر خواہ نخواہ ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔ پھر کانگریس والوں

کو ان ناموں کو استعمال کرنے کا ایک خاص ملکہ بھی حاصل ہے۔

کانگریس ایک قدیم جماعت ہونے کے ساتھ زیادہ آزمودہ کار، الیکشن جیتنے کے حربوں سے زیادہ واقف اور اُن سے کام لینے میں یکتا بھی ہے بلکہ لوگ تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ برسر اقتدار آنے کے بعد کانگریس نے جو بھی اصلاحی قدم اٹھائے ہیں۔ اس میں اس کی اصل یا مقدم غرض اپنے اقتدار کو استحکام بخشنا ہی رہا ہے۔ اور آزادی کے بعد اپنے مقاصد کی تعبیر و توضیح میں جو اُلٹ پھیر وہ اب تک کرتی آرہی ہے اس کا اصل مقصد بھی بس یہ تھا کہ پبلک کی توجہات کو دوسری بہت سی پارٹیوں سے ہٹا کر اپنی طرف مائل کر سکے۔

اور ان تمام باتوں پر طرہ یہ ہے کہ وہ عرصہ سے برسر اقتدار ہے اور مشکل ہی یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ جلد ہی اقتدار سے محروم ہو جانے والی ہے۔ اس لئے پرمٹ، لائسنس اور دیگر مفادات کے طلب گاروں کے لئے قدرتاً اس میں کشش زیادہ ہے۔ پھر برسر اقتدار ہونے کی بنا پر اسے اور بھی مواقع اور سہولتیں حاصل ہیں جن سے فائدہ اٹھانے کو کانگریس کے عام حلقوں میں چنداں معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں مخالف پارٹیوں کا شکوہ بہت عام ہے۔

غرض مذکورہ بالا اور اس طرح کے اور دیگر اسباب کی بنا پر چھوٹی بڑی تمام مخالف پارٹیوں کو اپنی آرزوؤں میں مسلسل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ اور انہی اسباب کی بنا پر اس الیکشن میں بھی، اُن ریاستوں تک میں جہاں بظاہر کانگریس کی کامیابی مشکوک نظر آرہی ہے۔ وہ اپنی کامیابی کی طرف سے سخت مایوس یا مشکوک ہیں۔ ان کو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ کانگریس اگرچہ اب اپنا اثر و مقبولیت بہت کچھ کھو چکی ہے اور عوام اس سے سخت بیزار ہیں۔ لیکن پہلے کی طرح اس الیکشن میں بھی وہ کسی نہ کسی طرح ان کا زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اور سب سے زیادہ ڈر ان کو اس بات کا ہے کہ اس مدت میں کانگریس ایک اصول پسند

پارٹی کے مقام سے گر کر اقتدار کی بھوکی پارٹی بن چکی ہے۔ اور نیچے سے اوپر تک اس میں خود غرض اور مفاد پرست لوگ گھس گئے ہیں۔ اس لئے کامیابی کے جو ہتھکنڈے اس سے پہلے استعمال ہوتے رہے ہیں، اس الیکشن میں وہ پہلے سے زیادہ استعمال ہوں گے۔ اور اُن کا مقابلہ ان کے لئے دشوار ہوگا۔

اپوزیشن پارٹیوں کا ردِ عمل

ان حالات کا قدرتی نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اس وقت کم و بیش سب ہی مخالف پارٹیاں ایک خاص طرح کے ذہنی اضطراب و خلجان یا احساسِ شکست کا شکار ہیں۔ اور اس نے بڑی آسانی کے ساتھ ان کا رُخ ہنگامہ آرائی کی طرف موڑ دیا ہے۔ اپنی اس ذہنی کیفیت کے ساتھ وہ اپنی کامیابی کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں پا رہی ہیں کہ عوام کے جذبات کو حکومت کے خلاف زیادہ سے زیادہ مشتعل کیا جائے اور ہر ممکن طریقے سے اس کو زیادہ سے زیادہ مشکلات میں مبتلا کر دیا جائے تاکہ اس کی نااہلیت اور ناکردگی زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو کر پبلک کے سامنے آجائے۔ ملک میں غذا کا مسئلہ ایک حقیقی مسئلہ ہے جس سے بلاشبہ پبلک بہت پریشان ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا بہرحال ضروری ہے لیکن اس کو حل کرنے کا یہ جو طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے کہ جا بجا "بند" کھڑے کئے جا رہے ہیں، جن کے پروگراموں میں غلہ لانے، لے جانے والی گاڑیوں کو روکنا اور ریل کی پٹریاں اکھاڑنا بھی اکثر شامل ہوتا ہے، یا آئے دن پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں جو شور و شغب یا ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں جن کی بنا پر بسا اوقات ان کی کارروائیاں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں یہ سب اسی طریقۂ کار کا ایک رُخ ہیں۔ اور بدقسمتی کی بات ہے کہ خود حکومت بھی اس معنی میں گویا ان کی شریک ہے کہ وہ اپنی غلطیوں سے مخالف پارٹیوں کو مقصد براری کے بہتر سے بہتر مواقع بھی فراہم کرتی رہتی ہے۔ اول تو اس کا طرزِ عمل ہی کچھ ایسا ہے کہ یہ مسلمہ ثابت ہو چکا ہے کہ معمولی سے معمولی بات جو کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو حکومت اس وقت تک اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگی جب تک کہ اس کے لئے احتجاج و مظاہرہ کا کوئی موثر طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ اس سے

خواہ مخواہ حکومت کے خلاف نفرت پھیلتی ہے اور عوام میں قانون شکنی کا رجحان پیدا ہو رہا ہے جس سے مخالفین پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کی مثال کے لئے یہاں یہ یاد دلانا کافی ہوگا کہ جب تک کیرلا میں ہنگامہ اور تشدد کے سنگین واقعات پیش نہیں آئے مرکز کو یہ احساس نہیں ہو سکا کہ وہاں چاول کی ضرورت ہے حالانکہ وہاں براہ راست مرکز ہی کی حکومت تھی۔ اور اسی طرح بنگال میں بھی شدید ہنگاموں اور جان و مال کے عظیم نقصانات کے بعد ہی وہ اقدامات کئے گئے جو اگر پہلے کئے گئے ہوتے تو شاید نوبت یہاں تک نہ پہونچتی۔

دوسرے حکومت مخالفین کے پیدا کردہ مسائل سے نبٹنے کے لئے وسعتِ نظر اور فراخ دلی سے کام لینے کے بجائے اکثر تنگ دلی اور تنگ نظری کا رویہ اپناتی ہے جس میں بعض اوقات پورے ملک کے مفاد کے مقابلہ میں محض اپنی پارٹی کے مفاد کو مقدم رکھنے کی جھلک بھی سامنے دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو وہ کسی معمولی مسئلہ کو خواہ مخواہ اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیتی ہے اور پھر ضد اور اصرار سے کام لے کر اسے بد سے بدتر بنا کر رکھ دیتی ہے۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے، پارلیمنٹ کے موجودہ برسگالی اجلاس میں حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہونے والی تھی اور مخالف پارٹیاں اس کے لئے مصر تھیں کہ عدم اعتماد کی تحریک ہونے کی بنا پر ان کی تحریک ہر مسئلہ سے پہلے زیر بحث آنی چاہیئے لیکن حکومت بضد رہی کہ وہ اس سے پہلے تخفیف زر کے مسئلے پر اپنا بیان پیش کرے گی اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ تحریکِ عدم اعتماد کی ایک خاص بنیاد بلکہ کہنا چاہیے کہ مخالفین کا حکومت کے خلاف سب سے مؤثر حربہ تھا اس لئے اس مسئلہ پر حکومت کے پیشگی بیان کا مطلب ان کے نزدیک یہی ہو سکتا تھا کہ حکومت اس کے ذریعہ ان کے اس مؤثر حربہ کو کند یا بے کار کر دینا چاہتی ہے۔ بہرحال یہ اصرار و انکار جاری رہا اور اس کا نتیجہ اس شکل میں برآمد ہوا کہ پارلیمنٹ کے وہ ڈیڑھ دن جن میں اودیت کے اس سوال پر بحث ہوئی ہے پارلیمنٹ کی پوری تاریخ کے تاریک ترین دن قرار دیے گئے ہیں اور ملک کے تقریباً تمام سنجیدہ حلقوں نے ان

ڈ۔ دنوں کی کارروائی کو جمہوریت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ اور اس کے لئے ایک نئے بڑے مستقل خطرہ کی علامت قرار دیا ہے لیکن یہاں دیکھنے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہو چکنے پر حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ حکومت اب عدم اعتماد کی تحریک کو مقدم قرار دینے پر راضی ہے، اس کا یہ مقصد پورا ہو گیا کہ کارروائی میں کسی چیز کو مقدم یا مؤخر کرنے کا فیصلہ کرنا حکومت کا کام ہے نہ کہ حزب مخالف کا! اور اس طرح بعد از خرابی بسیار پارلیمنٹ کی کارروائی معمول پر آگئی۔

ان باتوں کے ساتھ حکومت کے رویہ میں ایک خاص رجحان یہ بھی دیکھنے میں آرہا ہے کہ عوام کے جائز مطالبات پر بھی ہمدردانہ غور کرنے یا ان کے سلسلے میں اس سے کوئی غلطی ہو چکی ہو تو سیدھے طریقے سے اس کی تلافی کر دینے کی بجائے اصلاحِ حال کی غالباً سب سے بہتر تدبیر اس کے خیال میں یہ ہے کہ اسے پہلے سے جو وسیع قانونی اختیارات حاصل ہیں ان کو دل کھول کر استعمال کرے اور پارلیمنٹ میں اپنی پارٹی کی اکثریت کے بل پر مزید اختیارات بھی حاصل کرتی چلی جائے۔ ڈی آئی آر کا جا و بے جا بکثرت استعمال، ملک کی سلامتی کے لئے کسی فوری خطرہ کی عدم موجودگی میں بھی ہنگامی حالت کو برقرار رکھنے کے لئے اس کا اصرار اور پہلے کے کافی اور مؤثر قوانین کے ہوتے ہوئے بھی ملک کی حفاظت کے نام پر ایک نئے مستقل قانون کے اضافہ کی خواہش وغیرہ باتیں حکومت کے اسی رجحان کی علامت ہیں۔

جمہوریت کا مستقبل

مذکورہ بالا سلسلۂ کلام کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو جہاں یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ اس الیکشن میں مخالفین اپنی کامیابی کے لئے وہ طریق کار اختیار کر رہے ہیں جو پہلے الیکشنوں کے طریق کار سے اگر نوعیت میں نہیں تو کم از کم کمیت کے لحاظ سے تو ضرور مختلف ہیں اور اس کی وجہ وہ ذہنی اضطراب و کشمکش یا احساسِ شکست ہے جو الیکشن میں کانگریس کا مقابلہ نہ کر سکنے کی بنا پر ان میں پیدا ہوا ہے، وہیں یہ بات بھی پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ ان کا یہ طریق کار اور اس کے مقابلے کے لئے حکومت

کا طرزِ عمل دونوں ہی ملک کے لئے تباہی کا موجب ہوں گے۔

دونوں کے طرزِ عمل سے الگ الگ اور پھر ان دونوں کے ملنے سے ملک کو جو نقصانات پہونچ سکتے ہیں ان کی ایک لمبی فہرست تیار کی جاسکتی ہے لیکن ان سب نقصانات میں سب سے بڑا نقصان، جس کی تلافی مدتوں نہیں ہو سکے گی، یہ ہے کہ ان کی بدولت جمہوریت پر سے پبلک کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے۔ اور لاٹھی اور بھینس کی منطق روز بروز زور پکڑتی جارہی ہے

لوک سبھا کے اسپیکر ملک میں جمہوریت کے اتار چڑھاؤ پر رائے زنی کا غالباً ہر شخص سے زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ وہ اس ایوان کے مسند نشین ہیں جہاں ملک کے نقشہ کا خدوخال تیار ہوتا ہے اور جہاں ہندوستان بھر کے چھوٹے بڑے معمار اپنے نقشوں سمیت ان کے سامنے ہوتے ہیں انھوں نے آل انڈیا ووٹرز کونسل کے زیرِ اہتمام تقریروں کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اب جمہوریت اتنی پستی میں چلی گئی ہے کہ انقلاب کا آنا ممکن ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر ہری کشن مہتاب کانگریس کے ایک سابق ممتاز لیڈر ہیں۔ انھوں نے اہلِ ملک کو خبردار کیا ہے کہ موجودہ حالات ملک کو انقلاب کی طرف ڈھکیل سکتے ہیں جس کا پہلا نشانہ جمہوریت ہوگی۔

اور اسی طرح کے بیانات، سابق اٹارنی جنرل مسٹر سیتلواد اور دوسرے ماہرینِ آئین وسیاست بھی دے چکے ہیں البتہ کچھ ایسے لوگ ضرور ہیں جو ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد پسندانہ رجحانات کو محض اس لئے کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہے ہیں کہ ان کے خیال میں یہ محض الیکشن کے قرب کا صدقہ ہے اس لئے اس کے ختم ہوتے ہی ان کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اس "خوش گمانی" کی حقیقت کیا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ایس ملگاؤنکر ایڈیٹر ہندوستان ٹائمز کے ایک مضمون کا حسب ذیل اقتباس پڑھنا کافی ہوگا:۔

"کیا ملک میں وسیع پیمانہ پر پھیلی ہوئی موجودہ تشدد آمیز احتجاج کی لہر مخالف پارٹیوں کی انتخابی چالوں کا حصہ ہے جو یہ جانتی ہیں کہ آنے والے

عام انتخابات کے نتیجے میں انھیں کوئی خاص کامیابی حاصل ہونے والی نہیں ہے، جو بھی ثبوت ہمارے پاس ہیں وہ اس اطمینان بخش تصور کے منافی ہیں۔ مسٹر ایم ہی سیتلواد اور مسٹر سی، کے دفتری جیسے لوگ جو عجلت میں کوئی فیصلہ صادر کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ انھوں نے اشارہ کیا ہے کہ حقیقتِ حال انتہائی سنگین ہے اور صورت حال کو اس کے صحیح خدوخال میں دیکھنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر اختیار کرنے میں ہم جتنی زیادہ تاخیر کریں گے طوائف الملوکی کے تسلط کو ہم اپنے اوپر اتنا ہی زیادہ یقینی بنادیں گے۔ ملک میں لاقانونیت اور ضابطہ شکنی کی ایک عام فضا طاری ہے۔ آج جو کچھ ہمارے مشاہدے میں آرہا ہے اسے کسی بھیڑ کے جذبات کے اچانک بھڑک اٹھنے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا بلکہ اقتدارِ حکومت کی بالقصد نافرمانی اور عوام کا قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لینے کا رجحان ہے۔

یہ ایک خرابی ہے جو اَن پڑھ عوام تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ تمام طبقات کے نوجوانوں اور خوش پوش عہدہ داروں تک پھیل گئی ہے۔

یہ بات کہ مخالف پارٹیاں ان زبردست دشواریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں جن سے ملک اس وقت دوچار ہے صداقت کا صرف ایک جز ہے اور وہ بھی نہایت غیر اہم جز۔ کچھ مخالف پارٹیاں جمہوریت میں یقین نہیں رکھتیں اس لیے ان سے یہ توقع قائم کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ان کو احتجاج کے لیے اپنی سرگرمیاں صرف آئینی حدود تک محدود رکھنی چاہئیں۔

تشویشناک بات یہ ہے کہ ملک میں ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی ہے کہ ان پارٹیوں کے طریق کار کو عوام کے بڑے بڑے طبقات میں مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔

اس پر ایک دوسرے رُخ سے نظر ڈالیے۔ لوگوں کا اپنی بے اطمینانیوں کو دور کرنے کے لئے غیر آئینی ذرائع اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی نظروں میں جمہوریت ناکام ہو چکی ہے۔ اس لئے جمہوریت کو حقیقی خطرہ دراصل ان پارٹیوں سے نہیں جو جمہوریت کو بے معنی سمجھتی ہیں بلکہ حقیقی خطرہ ان سے ہے جو جمہوریت میں یقین رکھتے ہوئے بھی جمہوریت کو بروئے کار لانے میں ناکام ہوئے ہیں۔"

یہ ایک مسلّمہ بات ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت خود اس سرزمین کی پیداوار نہیں ہے۔ اس کا نازک پودا باہر سے درآمد کیا گیا ہے۔ اور وہ ابھی اپنی نشو و نما کی بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ اس کی جڑیں زمین میں زیادہ پیوست نہیں ہو سکی ہیں۔ اس لئے وہ پروان چڑھنے کے لئے ابھی بہت زیادہ رکھ رکھاؤ کا محتاج ہے مگر جب شروع ہی میں اسے مرجھا دینے والی گرم ہوائیں اس طرح چلنے لگی ہیں تو اس کے مستقبل کی طرف سے اندیشہ لاحق ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا آئندہ انجام کیا ہوگا۔

آئندہ انتخاب اور اپوزیشن کا اتحاد

(۲) یہ الیکشن اس لحاظ سے بھی پچھلے الیکشنوں سے بہت کچھ مختلف ہے کہ مخالف پارٹیاں اس موقع پر ایک دوسرے کے قریب آنے اور آپس میں کوئی نہ کوئی انتخابی سمجھوتہ کرنے کے لئے کچھ بے قرار سی نظر آ رہی ہیں۔

مختلف پارٹیوں کا مل جل کر الیکشن لڑنا یا آپس میں کوئی انتخابی سمجھوتہ کر لینا کوئی خاص یا اہم بات نہیں ہے۔ الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کا یہ ایک طریقہ ہے اور جہاں بہت ساری چھوٹی بڑی پارٹیاں اور خاصی بڑی تعداد میں آزاد امیدوار الیکشن میں حصہ لے رہے ہوں وہاں کے لئے تو یہ طریقہ ایک ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر ان کے لئے کم سے کم کامیابی حاصل کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر اس سے پہلے الیکشنوں میں بھی یہ طریقہ کسی نہ کسی درجے میں اپنایا جاتا رہا ہے۔ لیکن غالباً پچھلے الیکشنوں کے تجربات

اور ناکامیوں نے اس کی ضرورت کا احساس شدید سے شدید تر کر دیا ہے۔ اور مخالف پارٹیوں میں کانگریس کے خلاف جو مشترک جذبۂ نفرت پایا جاتا ہے وہ بھی اس کے لئے ایک موافق فضا پیدا کرنے میں معین ثابت ہو رہا ہے۔ پھر اس کے ساتھ مخالف پارٹیوں کے باہمی اتحاد یا سمجھوتہ کے جو خاص موانع تھے، وہ بھی اس مدت میں بہت کچھ رفع ہو چکے ہیں۔ بڑے موانع دو ہی تھے ایک بڑی پارٹیوں کا یہ اعتماد کہ وہ تنہا اپنے بل بوتے پر بھی زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کر سکتی ہیں اور گرتے پڑتے کسی نہ کسی دن اقتدار پر بھی قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ اور دوسرے اصول سے زیادہ ووٹروں کے جذبات کے پاس و لحاظ میں یہ رکھ رکھاؤ کہ کوئی انتخابی سمجھوتہ حتی الوسع انہی پارٹیوں سے ہونا چاہیئے، جن کے ساتھ کچھ نہ کچھ نظریاتی اتفاق کا بھی رشتہ ہو۔ مگر پچھلے الیکشنوں کے نتائج نے بڑی سے بڑی پارٹی کی خوش گمانیوں کا بھی پردہ چاک کر دیا ہے اور اب وہ سب یہ محسوس کرنے لگی ہیں کہ کانگریس ہر الیکشن میں ان کے مجموعی ووٹوں سے کم ووٹ حاصل ہونے پر بھی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں زیادہ سے زیادہ نشستوں پر قبضہ کر لیتی ہے تو یہ محض اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان کے ووٹ خود آپس میں تقسیم ہو کر بے اثر ہو جاتے ہیں۔

اور جہاں تک مذکورہ رکھ رکھاؤ کا تعلق ہے، اس کی پہلے بھی کچھ زیادہ مضبوط بنیاد نہیں تھی۔ اور جیسی کچھ تھی کانگریس کے خلاف جذبۂ نفرت نے اسے اور زیادہ کمزور بنا دیا ہے۔ مشہور بات ہے کہ محبت اور نفرت دونوں اپنے عمل میں حدود کی پابندی سے آزاد ہیں۔ پھر جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ رکھ رکھاؤ زیادہ تر عوام کے جذبات کی رعایت کا منت کش تھا اور اس مدت میں وہ خود بھی کانگریس سے نفرت کرنے میں بہت آگے جا چکے ہیں۔ اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بدقسمتی سے اس دوران میں ملک اخلاقی حیثیت سے اونچا ہونے کی بجائے بہت کچھ نیچے گرا ہے اور خاص طور سے مفاد پرستی اور جوعِ اقتدار کے لحاظ سے عوام اور عوامی پارٹیوں دونوں نے بہت کچھ ترقی کی ہے۔ اور

مفاد پرستی اور ہوسِ اقتدار کا خاصہ بھی نفرت و محبت کے خاصہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔

ان حالات کے پس منظر میں وہ دوڑ دھوپ اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے جو ملک کے طول و عرض میں پارٹیوں کے ملنے ملانے یا ایک دوسرے کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ وغیرہ کرنے کے سلسلہ میں ہو رہی ہے اور ان کو ذہن میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس پر مطلق تعجب نہ ہوگا کہ جو پارٹیاں پہلے ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے کی بھی روادار نہیں تھیں وہ اب ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہی ہیں اور ان کی روشنی میں یہ بات بھی کچھ زیادہ تعجب انگیز معلوم نہ ہوگی کہ کچھ پارٹیاں ایک جگہ کسی پارٹی سے ہاتھ ملا رہی ہیں اور دوسری جگہ اس کے مقابلہ کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ مذکورہ بالا اسباب کا براہ راست نتیجہ ہے جن میں کانگریس دشمنی کا جذبہ غالباً دوسرے تمام اسباب پر غالب ہے۔ راجہ جی اور ڈاکٹر لوہیا وغیرہ بہت پہلے یہ نعرہ لگا چکے ہیں کہ اس وقت مقدم کام کانگریس کو اقتدار سے محروم کرنا ہے اور ہر پارٹی کو یہ مقصد ہر چیز پر مقدم رکھنا چاہیئے۔ اس طرح کے نعرے جبکہ حالات بھی پوری طرح ساز گار ہو چکے ہوں بے اثر نہیں رہ سکتے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس الیکشن میں مذکورہ رکھ رکھاؤ کی بات بالکل ختم ہو کر رہے گی۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ اصول و نظریات کی کوئی اہمیت ہی باقی نہ رہے اور ملک کی ساری پارٹیاں بس جذبۂ نفرت اور ہوسِ اقتدار وغیرہ کی غلام بن کر رہ جائیں۔ ایسی صورت میں تو یہ ملک جہنم کا نمونہ بن جائے گا اور اس میں کسی معقول انسان کے لئے سانس لینا بھی دشوار ہوگا! ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اگر اصول و نظریات کے لئے نہیں تو کم از کم مفادات کی خاطر یہ پارٹیاں الیکشن میں ایک دوسرے سے جڑنے اور کٹنے کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ اصول ضرور اپنائیں گی اور آئندہ الیکشن کا نقشہ اس سے پیدا ہونے والی صورتوں کے مطابق ہی تیار ہوگا۔

اتحاد کی شکلیں اس نقشہ کی آخری شکل کیا ہوگی۔ اس کے بارے میں کوئی پیشگی اندازہ

کرنا بہت مشکل ہے خصوصاً اس بات کے پیش نظر کہ جیسا کہ گذر چکا ہے، ملکی سیاست بد قسمتی سے اصولوں سے زیادہ وقتی مصالح یا مفادات کے تابع ہے لیکن یہ بات کچھ قطعی سی نظر آرہی ہے کہ مختلف پارٹیوں کی ایک دوسرے سے قریب آنے کی یہ پینگ کچھ زیادہ بڑھ نہ سکے گی اور بالآخر یہ پارٹیاں پہلے تو دائیں اور بائیں بازوؤں میں تقسیم ہو کر دو الگ الگ صفوں میں تقسیم ہو جائیں گی اور پھر ان دونوں صفوں میں سے مزید ذیلی صفیں برآمد ہوں گی۔

جہاں تک پہلی تقسیم کا معاملہ ہے اس کو روکنا تو غالباً ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے اسباب و محرکات میں نظریات کا سوال بھی شامل ہے جس کی اہمیت بالکل ختم نہیں ہو گئی ہے۔ ہاں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ مخالف پارٹیاں کسی ذہنی مفاہمت کی بنا پر اپنی مخالفت و کشمکش کا رخ ایک دوسرے کی طرف رکھنے کی بجائے کانگریس کی طرف موڑ دیں، لیکن اس میں بھی کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ سب مل کر کانگریس کے داؤ پیچ کو ناکام بنانے پر آمادہ ہوں۔ اور اس بارے میں ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔

البتہ ذیلی تقسیموں کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ اس کا روکنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس تقسیم میں اصول و نظریات کا دخل کم سے کم اور مقامی حالات و مصالح اور شخصیتوں کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اور ان میں توافق و تطبیق اور مفاہمت پیدا کر لینا نسبتاً آسان ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مخالف پارٹیوں کی سمجھ بوجھ اور حسن تدبیر کی اصل امتحان گاہ درحقیقت یہی میدان ہے جس میں کامیابی و ناکامی پر ان کی اور کانگریس دونوں کی فتح و شکست کا بہت کچھ دار و مدار ہے۔ کم از کم اسمبلیوں کے انتخابات کی حد تک۔

اس وقت تک جو حالات سامنے آچکے ہیں ان کے مطابق پہلی تقسیم غالباً اس طرح ہو گی کہ دایاں بازو جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کے باہمی سمجھوتہ اور اشتراک سے تشکیل پذیر ہو گا اور دائیں بازو کی دوسری پارٹیاں ہندو مہاسبھا اور رام راج پریشد وغیرہ ان کے ساتھ شریک

ہو جائیں گی اور بایاں بازو کمیونسٹوں کی سربراہ کاری میں منظم ہوگا اور بائیں بازو کی دوسری پارٹیاں ان کا ساتھ دیں گی، لیکن بحالاتِ موجودہ اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ ان دونوں بازوؤں میں سے کسی کا بھی اندرونی اتحاد کوئی مضبوط اور ٹھوس شکل اختیار کر سکے گا۔ کیونکہ یہ مرکب جن عناصر پر مشتمل ہے اول تو ان میں تھوڑے بہت نظری اتفاق کے باوجود پالیسی، پروگرام اور طریق کار کے شدید اختلافات پائے جاتے ہیں جن کے ساتھ بہت کوشش کے بعد بھی ان عناصر میں توافق کا صحیح توام پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور دوسرے ان میں ایک دوسرے سے ملنے کا جذبہ بھی کچھ زیادہ طاقتور نہیں ہے کیونکہ کم از کم چھوٹی پارٹیاں یہ خوف محسوس کر رہی ہیں کہ کہیں یہ خود ان کے وجود کے تحلیل ہو جانے کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ انھوں نے اپنا جداگانہ پلیٹ فارم قائم کیا اور اس کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہیں اور پھر وہ جا بجا اپنے مخصوص حلقہ ہائے اثر رکھتی ہیں جن سے انھیں اپنی کامیابی کی بہت کچھ توقعات ہیں اور ظاہر ہے وہ اسی صورت میں ان سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں جب دوسروں کے ساتھ ملنے کے باوجود ان کی اپنی حیثیت بھی برقرار رہے۔

لفٹسٹ پارٹیوں کا اجتماع

یہ باتیں ہم محض ظن و قیاس کی بنیاد پر نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ان کے پیچھے واقعات کی شہادتیں موجود ہیں، دور جانے کی ضرورت نہیں ابھی حال میں سات لفٹسٹ پارٹیوں کے نمائندوں کا اجتماع ہوا تھا، جو کئی روز تک جاری رہا۔ اس اجتماع کی بات چیت کے جو نتائج سامنے آئے ہیں صرف ان پر ایک سرسری نگاہ ڈال لینا ان باتوں کی تصدیق کے لئے کافی ہوگا۔

یہ نمائندے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے تھے کہ کانگریس کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے انھیں کیا تدابیر اختیار کرنی ہیں۔ اس سلسلہ میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوا کہ کانگریس کی حکومت کو ختم کر کے وہ جو حکومت قائم کریں گے اس کی نوعیت کیا ہوگی اور وہ کس پروگرام کو زیر عمل لائے گی۔ لیکن اس مسئلہ پر بات چیت اس سے آگے نہ بڑھ سکی کہ فی الحال اس

حکومت کا ایک عنوان طے کر دیا گیا ہے یعنی وہ "نان کانگریس" حکومت ہوگی۔ پروگرام وغیرہ کا مسئلہ یا تو زیر بحث آ ہی نہیں سکا، کیونکہ اس اجتماع میں حصہ لینے والی پارٹیوں میں سے کم از کم ایک پارٹی پی ایس پی نے اپنا یہ رویہ پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ سرے سے اس کی قائل نہیں ہے کہ کل ہند سطح پر کوئی مشترک پروگرام طے کیا جائے اور اسی بنا پر وہ اس مسئلہ پر گفتگوؤں میں پہلے بھی شریک نہیں ہوئی تھی اور اس اجتماع میں اس کی اور اس کے دوسرے جو ہم خیال رہے ہوں، ان کی خاطر داری ضروری سمجھی گئی تاکہ بات چیت اسی مرحلہ میں شکست سے دوچار نہ ہو جائے۔ یا اس موضوع پر بات چیت تو ہوئی لیکن وہ کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی اور مجبوراً اس کا خیال چھوڑ دیا گیا ہو یا آئندہ کسی اور موزوں وقت کے لئے اٹھا رکھا گیا ہو جو شاید ہی آسکے۔

اور عنوان کا جو مسئلہ طے ہوا ہے اس کی اس لحاظ سے اہمیت ضرور ہے کہ یہ بھی ایک اچھا خاصہ اختلافی مسئلہ تھا۔ ایک طرف ایس ایس پی اور لفٹسٹ کمیونسٹ پارٹی تھی جو اس لفظ کے لئے اصرار کر رہی تھی جو طے ہوا ہے اور دوسری طرف رائٹسٹ کمیونسٹ پارٹی اور بعض اور پارٹیاں تھیں جن کو اس لفظ میں یہ خطرہ پنہاں نظر آ رہا تھا کہ اس سے ان پارٹیوں کی شرکت کا بھی دروازہ کھل جائے گا جن کو وہ رجعت پسند سمجھتی ہیں اس لئے ان کو اس لفظ کی بجائے "جمہوری حکومت" کا لفظ استعمال کرنے پر اصرار تھا جس کا ایک اور محرک خاص طور سے کمیونسٹ پارٹی کے لئے ممکن ہے یہ بھی رہا ہو کہ وہ جس طرزِ حکومت کے داعی ہیں، اس کو بھی وہ جمہوریت ہی کی ایک قسم سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عام طور سے ان کو جمہوریت دشمن ہی سمجھا جاتا ہے۔

بہرحال عنوان کے مسئلہ کے طے ہو جانے کی اہمیت ضرور ہے۔ اس سے کم از کم ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے سمجھوتہ کرنے کے جذبہ و خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جب آئندہ قائم ہونے والی حکومت کے پروگرام کا مسئلہ زیر بحث نہیں آسکا۔ یا اسے مشکل سمجھ کر ختم یا ملتوی کر دیا گیا ہے تو محض آئندہ حکومت کے عنوان کا طے ہو جانا کوئی خاص معنی

نہیں رکھتا۔

یہ بات بھی بڑی حد تک مشتبہ ہے کہ عنوان طے کرنے میں نظریات کا جو اختلاف سامنے آیا تھا وہ اس کے طے ہو جانے کے بعد عملاً بھی ختم ہو جائے گا حالانکہ ان نظریات کا تعلق الیکشن کے ضمن کے بعض ایسے عملی مسائل سے بھی ہے جن سے پہلو بچانا مشترکہ محاذ کے لئے کسی طرح ممکن نہ ہو سکے گا۔ اور آل انڈیا سطح سے نیچے ریاستوں کی سطح پر بھی ان کو کسی نہ کسی شکل میں طے کرنا ضروری ہوگا مثلاً مشترکہ محاذ سے باہر کی پارٹیوں سے سمجھوتہ کا مسئلہ۔ اور حالت یہ ہے کہ محاذ تو محاذ اس میں شریک ایک جماعت یعنی پی ایس پی کا اس مسئلہ میں اندرونی اختلاف اس درجہ کو پہنچ چکا ہے کہ اس کی مجلس عاملہ کے ایک نہایت ممتاز ممبر مسٹر کامتھ نے پچھلے دنوں محض اس مسئلہ میں عاملہ کے فیصلہ سے اپنے اختلاف کی بنا پر اس کی نیز پارلیمنٹری بورڈ کی ممبری سے بھی استعفا دے دیا تھا اور اس کے ایک دوسرے ممبر مسٹر الوار ایس کو بھی اس مسئلہ میں عاملہ کے فیصلہ سے اختلاف ہے۔ عاملہ کا فیصلہ کیا تھا؟ اس کی ابھی پوری تفصیل سامنے نہیں آسکی ہے۔ لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس کا خاص تعلق کمیونسٹوں سوتنتر پارٹی، جن سنگھ اور مسلم لیگ کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ کرنے سے ہے۔ بہرحال یہ اختلاف اس درجہ کو پہنچ چکا ہے کہ پارٹی کے جنرل سکریٹری کے اعلان کے مطابق اب یہ مسئلہ جنرل کونسل میں زیر بحث آنے والا ہے جو آئندہ اکتوبر میں لکھنؤ میں منعقد ہوگی اور ان کے بقول کونسل تمام حالات کا جائزہ لیکر جو فیصلہ بھی صحیح اور مناسب سمجھے گی اختیار کرے گی۔ اور غالباً اسی بات کے پیش نظر مسٹر کامتھ نے اپنا استعفا واپس لے لیا ہے۔

لفسٹ پارٹیوں کے مذکورہ اجتماع کی کارروائی کی یہ بات بھی خاص طور سے توجہ طلب ہے کہ کل ہند سطح پر کسی اتفاق پر پہنچنے میں ناکام ہونے پر انھوں نے ریاستی سطح پر جن باتوں پر اتفاق کیا ہے وہ بھی بہت مبہم اور کچھ یونہی سی ہیں۔ اجتماع کے خاتمہ پر جو باضابطہ اعلان مسٹر مادھو لمائے کی طرف سے شائع ہوا ہے اس سے صرف دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

اول یہ کہ اس اتحاد میں شریک ہر پارٹی اس کے لئے آزاد ہے کہ جن علاقوں میں یہ پارٹیاں اپنی انتخابی جد و جہد چلانے کے قابل نہیں ہیں، وہاں وہ اس اتحاد سے باہر کسی گروپ سے بھی اپنا انتخابی سمجھوتہ کر سکتی ہیں۔

اور دوسرے یہ کہ ہر پارٹی اس کے لئے آزاد ہے کہ وہ اپنے علیحدہ مینی فیسٹو کے ساتھ ووٹروں تک پہنچے۔ بالفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ پارٹیاں کئی روز کی محنتِ شاقہ کے بعد اس پر متفق ہو گئی ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کر سکتیں۔ حد یہ ہے کہ ان کے درمیان اس پر بھی اتفاق نہیں ہو سکا کہ کل ہند سطح پر کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو ریاستوں میں پارٹیوں کی سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کر سکے، اور خود ریاستوں میں "حکومتی پروگرام" کے مسئلہ کو ابھی ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے، اسے آئندہ کے لئے اٹھا رکھا گیا ہے۔ آئندہ اسے کس طرح طے کیا جائے گا، اس کے بارے میں دو تجویزیں زیر غور آئی تھیں۔ ایک یہ کہ سیمینار منعقد کر کے ان پر گفتگو کی جائے اور دوسری یہ کہ مرکزی سربراہوں کی موجودگی میں ان پارٹیوں کے ریاستی نمائندوں کی بات چیت کا انتظام کیا جائے۔ لیکن ان کے بارے میں بھی کوئی آخری بات طے نہیں کی گئی ہے۔

یہ حال ان پارٹیوں کا رہا ہے جن کے اندر موجودہ حکومت کو بدلنے کی بہت زیادہ بے قراری بھی ہے اور حالات کے مطابق اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کر لینے کی زیادہ صلاحیت بھی۔ اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دائیں بازو کی پارٹیوں کی اس طرح کی کوششیں کہاں تک بار آور ہو سکتی ہیں۔ جبکہ ان میں کی بڑی پارٹیوں میں بعض پر جذباتیت کا پورا غلبہ ہے اور بعض دوسری خود بھی اندرونی طور سے بہت سے اہم مسائل کے سلسلہ میں انتشار اور اختلافِ رائے کا شکار ہیں اور یہ نقشہ تو اس وقت کا ہے جبکہ الکشن ابھی دور ہے۔ کامیابی اور ناکامی کے مناظر جب بالکل سامنے ہوں گے اس وقت اصولوں یا ایک دوسرے کی کہاں تک رو رعایت ہو سکے گی اس کا حال تو مستقبل ہی بتا سکے گا۔

منفی اتحاد

اصل یہ ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں ان پارٹیوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا قوی تر محرک، کانگریس دشمنی کا جذبہ ہے اور اس طرح کی کوئی منفی قوت یہ صلاحیت تو ضرور رکھتی ہے کہ مخالف عناصر کو بھی کہیں اکٹھا کر دے، لیکن وہ انھیں جوڑ بھی سکے، یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے اور جب تک یہ بات کسی معتد بہ حد تک پیدا نہیں ہوتی ہے کانگریسی حکومت کو ختم کر دینے کا خواب خواب ہی رہے گا کانگریس کی نااہلیت اور ناکردگی اپنی جگہ مسلم ہے اور اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی بنا پر عوام بھی اس سے سخت بیزار ہو چکے ہیں لیکن آخر عوام یہ بھی تو دیکھنا چاہیں گے کہ ان کو جو بدل فراہم کیا جا رہا ہے وہ خود بھی کیسا ہے اور غلط کار اور نااہل لوگوں کی جگہ جو لوگ لینا چاہتے ہیں وہ کہاں تک ان سے بہتر ہو سکیں گے۔ اس لئے بحالاتِ موجودہ کانگریس کے خلاف تمام مخالفانہ کد و کاوش کا حاصل کُل ہند سطح پر بس اتنا ہی نظر آتا ہے کہ کانگریس کی قوت کچھ کم ہو جائے اور مخالفین اپنی صلاحیتوں اور کوششوں کے تناسب سے اپنی قوت کچھ اور بڑھا لے جائیں۔ اور یقیناً اضافۂ قوت کے پہلو سے وہ پارٹیاں زیادہ بہتر حالت میں ہوں گی جو اس وقت ملنے ملانے کی کوششوں میں پیش پیش ہیں۔ کیونکہ ان کی یہ کوششیں ہر پہلو سے رائیگاں نہیں جائیں گی۔ اور عوام کی کانگریس دشمنی بھی جن کی نگاہ میں ان کوششوں کی بڑی قدر ہو سکتی ہے انھیں ان کا کچھ نہ کچھ صلہ ضرور دے گی۔

ہاں یہ بات بحالاتِ موجودہ بھی ممکن نظر آتی ہے کہ چند صوبوں میں کانگریس کو اقتدار سے محروم ہونا پڑے مثلاً گجرات، اڑیسہ، راجستھان، کیرلا اور بنگال۔ ان میں سے تین پہلے صوبوں میں دائیں بازو اور بقیہ دو میں بائیں بازو کی پارٹیوں کا پہلے ہی سے خاصا اثر ہے اور جب مخالف پارٹیاں ریاستوں ہی کو اپنی جد و جہد کا مرکز بنانے کا خاص رجحان رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں ڈھیل اور نرمی کا رویہ اختیار کرنے پر بھی آمادہ ہیں جیسا کہ مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے اتحاد سے واضح ہوتا ہے تو کانگریس کو یقیناً ان کے مقابلہ میں دشواری پیش آئے گی۔ الا یہ

کہ وہ پچھلے الیکشن کی طرح عین موقع پر گواجیسی کسی مہم کے ذریعہ عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ یا جوڑتوڑ کے ذریعہ مخالفین کی طاقت کو مجتمع ہونے کا موقع ہی نہ دے جس کا امکان اب کم سے کم ہے۔

ملک کے موجودہ حالات اور الیکشن میں مختلف پارٹیوں کی کامیابی یا ناکامی کے امکانات کا جو جائزہ اوپر پیش کیا گیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہر محب وطن کا یہ فرض ہے کہ وہ اس سوال پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرے کہ ہمارے ملک کا مستقبل کیا ہوگا اور مسلمانوں کو ہم اس سوال پر غور کرنے کی خاص طور سے دعوت دینا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے مستقبل کا ہندوستان کے مستقبل سے نہایت گہرا ربط ہے اور مزید برآں اس سوال سے ان کی اپنی مخصوص ذمہ داریوں کا سوال بھی وابستہ ہے، ہم اسے ہرگز ضروری نہیں سمجھتے کہ ہمارے اس جائزہ سے ہر شخص لازماً اتفاق ہی کرے البتہ ہم یہ ضرور خواہش رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص ان کے ذمہ دار حضرات ملک کے موجودہ حالات اور آئندہ کے امکانات کا اپنے اپنے طور سے جائزہ لیں اور اس کی روشنی میں اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں، اگر یہ احساس کسی درجے میں بھی ان کے اندر پیدا ہوگیا تو ہم اسے بھی بسا غنیمت سمجھیں گے کیونکہ ہم نے یہ سمع خراشی مخصوص طور سے ان کو ہی اس اہم سوال کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کی ہے، کاش ہماری یہ آرزو پوری ہوسکے۔

مسلمانوں کا اتحاد و تنظیم

اور

الیکشن

تقسیم کے بعد ملک میں جو حالات پیدا ہوئے ان کا مسلمانوں پر ایک خاص ناگوار اثر یہ مرتب ہوا تھا کہ عام طور سے وہ ملکی مسائل سے کچھ الگ تھلگ سے رہنے لگے تھے۔ ان پر مایوسی اضطراب اور بے یقینی کا غلبہ تھا۔ اس لئے وہ جہاں تھے ٹھٹھر کر رہ گئے تھے۔ حرکت و جنبش کے نام سے بھی ان پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ ان کا کام بس جان کی خیر منانا یا حکومت وقت کا وظیفہ پڑھنا رہ گیا تھا اور بس۔

اس کیفیت کا اثر لامحالہ جنرل الیکشن کے بارے میں ان کے عمومی رویہ پر بھی پڑنا چاہیئے

ہی تھا۔ چنانچہ دو الیکشن تو اس طرح گذرے کہ عام طور سے مسلمانوں نے ان سے کچھ زیادہ غرض و واسطہ نہیں رکھا۔ ان کی دلچسپی زیادہ تر بس اس کے اندر محدود رہی کہ ووٹ دینے کا وقت آیا تو خاموشی کے ساتھ دو بیلوں کی جوڑی کو تلاش کر کے اسے ووٹ دے آئے۔ اور تیسرے جنرل الیکشن میں بھی تقریب قریب یہی کیفیت باقی رہی۔ بس اتنا فرق ہوا کہ کہیں کہیں یہ احساس اُجاگر ہوا کہ اس کیفیت کا باقی رہنا کہاں تک ان کے لئے مفید ہے۔ اور اسی احساس کے تحت کچھ لوگوں نے اپنے لئے سعی و کوشش کے کچھ نئے میدان بھی تلاش کئے۔ لیکن حالات کی ناسازگاری نے انھیں بھی کچھ آگے بڑھنے نہیں دیا۔

اب چوتھا جنرل الیکشن سامنے ہے اور یہ دیکھ کر ہمیں خوشی ہو رہی ہے کہ اس بار کیفیت پہلے سے بہت کچھ بدلی ہوئی ہے۔ اپنی موجودہ حالت پر بے اطمینانی ان میں بہت عام ہو چکی ہے۔ مایوسی اور بے یقینی کے بادل بھی بہت کچھ چھٹ چکے ہیں اور ان کے اندر ایک نیا جوش و جذبہ پرورش پا رہا ہے۔ اور ان کے سوچنے کے انداز میں بھی تبدیلی کے آثار نمایاں ہیں

مسلمانوں کے رویّہ کی ان تبدیلیوں کا اندازہ ان مضامین اور مراسلات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو الیکشن کے موضوع پر مسلم پریس میں برابر شائع ہو رہے ہیں نیز متعدد مسلم جماعتوں کا جو طرز عمل اس وقت تک سامنے آسکا ہے اس سے بھی اس نئے موڑ کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔

مسلم مجلس مشاورت مسلمانوں کا ایک مشترکہ ادارہ ہے جس میں مسلمانوں کی تقریباً سب ہی جماعتوں اور قابل ذکر مکاتب فکر کے نمایاں افراد شامل ہیں۔ اس مجلس نے ابھی حال میں اپنا ایک منشور اس غرض سے شائع کیا ہے کہ اس کے حق میں رائے عامہ ہموار کی جائے۔ اس منشور میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ اظہار کیا گیا ہے کہ

"مسلمانوں نے کسی پارٹی کے لئے خطِ غلامی نہیں لکھ دیا ہے

وہ اپنے حقِ انتخاب کو اپنی صواب دید کے مطابق اپنے اور ملک کے مفاد کے لئے بہتر طریق پر استعمال کر سکتے ہیں "۔

اور مزید برآں اس منشور میں کانگریس کے ۱۹ سالہ دورِ حکومت پر اس پہلو سے تنقید بھی کی گئی ہے کہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ اس کا معاملہ منصفانہ نہیں رہا ہے۔ اور ان کے حقوق اور جائز مطالبات کو بھی دیانت داری کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اور اس کی ایک وجہ کانگریس کی یہ "غلط فہمی" قرار دی گئی ہے کہ "مسلمانوں نے دائمی طور پر اپنی قسمت ایک پارٹی سے وابستہ کر دی ہے "۔

یہ واضح رہے کہ مسلم مجلسِ مشاورت میں خود کانگریس کے بھی متعدد رہنما اور افراد شامل ہیں اور ان کا رشتہ اب بھی کانگریس سے برقرار ہے۔

مسلم جماعتوں میں مسلم لیگ وہ جماعت ہے جو براہ راست الیکشن میں حصہ لیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی سرگرمیاں صرف جنوب کی ایک دو ریاستوں تک محدود ہیں۔ اس جماعت کے بارے میں یہ بات منظرِ عام پر آچکی ہے کہ اس نے الیکشن میں کانگریس کا ساتھ دینے سے صاف طور پر انکار کر دیا ہے اور کیرلہ میں کمیونسٹوں کے بائیں گروپ سے اور مدراس میں سوتنتر پارٹی اور ڈی۔ ایم۔ کے سے انتخابی سمجھوتہ بھی کر لیا ہے اور یہ وہ جماعت ہے جس کے بڑے بڑے لیڈروں کے بارے میں یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ کمیونزم کے، بڑے بڑے مولویوں سے بھی کہیں زیادہ مخالف ہیں۔ اور گذشتہ جنرل الیکشن میں اس جماعت کا یہ طرزِ عمل رہ چکا ہے کہ کانگریس کے ساتھ مل کر اس نے کمیونسٹوں کا مقابلہ کیا تھا اور کیرلہ سے کمیونسٹوں کی حکومت کو ختم کرنے کی تحریک میں بھی اس نے کانگریس اور دیگر پارٹیوں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔

جمعیۃ العلماء کی روش

جمعیۃ العلماء اپنے اعلان کے مطابق تقسیمِ ہند کے بعد ہی سے سیاست سے سبکدوش ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود پچھلے الیکشن تک

اس کے بڑے بڑے لیڈر مسلمانوں کو یہ فتویٰ یا مشورہ دیا کرتے تھے کہ ان کے لئے کانگریس ہی سب سے بہتر جماعت ہے اس لئے انھیں اسے کامیاب بنانے میں ہر طرح مدد کرنی چاہیئے۔ اور وہ خود بھی کانگریسی امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لئے ملک بھر کا دورہ کیا کرتے تھے۔ لیکن اب خود اس کا آرگن "الجمعیۃ" یہ سوال اٹھاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ اگر وہ کسی ایک رخ کی طرف ڈھل جائیں تو انقلاب برپا کر دیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر کانگریس کبھی مسلمانوں کی طرف مائل نہیں ہوتی، دراں حالیکہ وہ ووٹوں کی محتاج ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اور پھر وہ خود اپنے اس سوال کا جواب ان لفظوں میں دیتا ہے:-

"کانگریس پانچ سال تک مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو مرعوب کر کے یہ اطمینان کر لیتی ہے کہ ان سے کہو یا نہ کہو، بہرحال وہ کانگریس ہی کو ووٹ دیں گے۔ اگر کسی زحمت کے بغیر مسلمانوں کے ووٹ کانگریس کے لئے رزرو سمجھ لئے گئے ہیں تو کانگریس ان کے پیچھے کیوں پھرے اور غیر مشروط تعاون کو مشروط کیوں بنائے۔"

اور یہ وجہ بیان کرنے کے بعد وہ مسلمانوں کو مشورہ دینے کے انداز میں لکھتا ہے:-

"مگر شاید اب وقت آگیا ہے کہ خوددار شہریوں کی طرح مسلمانوں کو اپنی اس پوزیشن پر نظر ثانی کرنی چاہیئے۔ چھ کروڑ مسلمان بھیڑ بکری نہیں ہیں کہ وہ خود بخود کسی ایک جماعت کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے آپ کو بے وزن ثابت کریں اور انتخاب جیسی مہم میں بھی ع

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

کی تصویر بن کر رہ جائیں۔"

جمعیۃ کے آرگن میں ان سطروں کا شائع ہونا خواہ وہ اس کے ایڈیٹر کی محض ذاتی رائے ہی کا عکس کیوں نہ ہوں، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اس اخبار نے اپنے اس اداریہ کے شائع ہوتے کے دوسرے ہی روز یہ انکشاف کرکے اس ذاتی رائے کو بھی یک گونہ سرکاری حیثیت دے دی ہے کہ اس بارے میں جمعیۃ کے قریبی حلقوں کا کیا تاثر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ :۔

"جب ہم نے قریبی حلقوں سے رابطہ قائم کیا تو ایک بات واضح طور پر سامنے آئی وہ یہ کہ خود جمعیۃ علمار ہند جماعتی حیثیت سے پارلیمنٹری سیاست سے الگ ہے اس لئے وہ کسی سیاسی جماعت سے اپنے آپ کو نتھی نہیں کرسکتی۔ اصولی طور پر مسلمان ہر غیر فرقہ وارانہ جماعت کو ووٹ دے سکتے ہیں اور وہ اپنے ووٹ استعمال کرنے میں آزاد ہیں۔ جمعیۃ العلمار ان کے فیصلہ میں مخل نہ ہوگی۔"

جمعیۃ کے "قریبی حلقوں" کی یہ رائے اپنے مفہوم میں واضح ہے اور اگر اس میں کوئی ابہام تھا تو جناب ایڈیٹر صاحب نے اس کی مزید توضیح کرکے اسے بھی دور فرما دیا ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"الیکشن کا معاملہ پارلیمنٹری سیاست سے متعلق ہے اور اس میں مسلمان حصہ لینے میں بالکل آزاد ہے اس میں جمعیۃ علمار ہند کو دراندار ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے خیال میں جمعیۃ علمار کی پوزیشن بہت صاف ہے اور اس سے مسلمانوں کو رہنمائی بھی مل سکتی ہے۔"

"الجمعیۃ" نے جمعیۃ علمار کے مسلک کی وضاحت میں اس کے "قریبی حلقوں" کی رائے کا حوالہ دیا تھا۔ کسی ذمہ دار کا نام نہیں لیا تھا۔ لیکن چند ہی روز بعد "الجمعیۃ" ہی میں اس کے جنرل سکریٹری کے نام سے ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ موقف

بالکل سرکاری حیثیت رکھتا ہے۔

نامہ نگار نے سوال کیا تھا کہ "کانگریس پارٹی کے اٹھارہ سال کے تجربے کے بعد کیا وہ اس قابل ہے کہ اسے مزید آزمایا جائے" اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ:

"جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی اور آزمایا جائے وہ آزمائیں، جو بالکل مایوس ہو چکے ہیں وہ اس سے کنارہ کش ہو جائیں۔ جمعیۃ علمار کی اس بارے میں کوئی پالیسی نہیں ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں جمعیۃ علمار کی تو صرف دو پالیسیاں ہیں (۱) الیکشن سے کنارہ کشی (۲) ہر طرف سے مسلم مفاد کے لئے کوشش کرنا"

مسلمانوں اور مسلم جماعتوں کے طرزِ عمل میں جو تبدیلیاں اس موقع پر نمایاں ہوئی ہیں ہیں، ان کے اچھے یا برے ہونے سے قطع نظر ان پر ہمیں اس حیثیت سے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کی اوّلین ضرورت کے طور پر جن باتوں کو چھوڑنے کی دعوت روزِ اوّل سے دیتے رہے ہیں یہ تبدیلیاں ان سے ان کی کنارہ کشی کا ایک نمایاں ثبوت پیش کر رہی ہیں اور ان کی بنا پر غالباً یہ توقع قائم کرنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ مسلمانوں کو جس منزل کی طرف قدم اٹھانا چاہیئے یہ تبدیلیاں انشاء اللہ اس کے لئے ایک طرح سے پیش خیمہ ثابت ہوں گی۔

تقسیم کے بعد مسلمانوں پر جو حالت طاری ہوئی تھی۔ اور جس کے نتیجہ میں ان کو الیکشن جیسے مسئلہ سے کبھی جس کا بہرحال ان پر بھی گہرا اثر پڑتا رہا ہے، کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یا تھی تو بیشتر اس حد تک کہ آنکھیں بند کر کے کانگریس کو ووٹ دے دیا کریں، اس کو ہم ان کے حال و مستقبل کے لئے انتہائی تباہ کن سمجھتے رہے ہیں۔ ہمارا احساس یہ تھا کہ اس طرح کے مایوسانہ اور مرعوبانہ ذہن و روش کے ساتھ وہ اپنے ملی فرائض تو خیر کیا ادا کر سکیں گے خدانخواستہ اپنی رہی سہی ملی خصوصیات بلکہ اپنی ملی حیثیت بھی باقی نہ رکھ سکیں گے۔ اس لئے شروع ہی سے ہم نے اپنا فرض سمجھا تھا کہ ان کی اس ذہنیت کو بدل کر ان کے اندر اپنی صحیح ملی حیثیت کا شعور بیدار کرنے کی کوشش کریں اور کم از کم ان کو ان راستوں پر چلنے سے حتی الوسع باز رکھیں

جن پر چلنے سے یہ خطرہ یقینی طور سے سامنے آکر رہے گا۔ چنانچہ اپنے انہی احساسات کے تحت پچھلے ہر جنرل الیکشن کے موقع پر ہم نے اپنی اصلی دعوت ان کے سامنے پیش کرنے کے ساتھ ان کو ان باتوں کی طرف متوجہ کرنے کی بھی ہم نے خاص طور سے کوشش کی ہے اور خاص اس مقصد کے لئے کچھ پمفلٹ اور کتابچے بھی شایع کرتے رہے ہیں۔ جن میں "مسئلۂ انتخابات" اور "پس چہ باید کرد" کے کتابچے بھی شامل ہیں۔ پہلا کتابچہ پہلے جنرل الیکشن کے موقع پر شایع ہوا تھا اور دوسرا آخری الیکشن کے وقت۔ اور ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم نے ان کی ملّی حیثیت کی قدر و عظمت نماں کرنے کے ساتھ اس کو پیش آنے والے خطرات سے انھیں آگاہ کرنے اور اسی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لینے اور نہ لینے کی شکلوں اور ان کے فائدہ و نقصان سے بھی انھیں آگاہ اور متنبہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

ان تبدیلیوں پر ہمیں اس حیثیت سے بھی خوشی ہوئی ہے کہ ان سے یک گونہ الیکشن میں صحیح رُخ سے حصہ لینے کی راہ کی ایک رکاوٹ دور ہوتی نظر آرہی ہے۔ جو لوگ ہماری دعوت سے واقف ہیں وہ اس بات سے بھی واقف ہوں گے کہ ہم الیکشن کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتے ہیں جس کے تحت ہم چند شرائط کی تکمیل کے بغیر عملاً الیکشن میں حصہ لینے کو صحیح نہیں سمجھتے اور قدرتاً ہماری خواہش یہ بھی ہے کہ عام مسلمان بھی ہمارے اس نقطۂ نظر کو صحیح سمجھ کر ان کی تکمیل کے بغیر الیکشن سے کنارہ کش رہنے کو ترجیح دیں۔ لیکن ہمارے اس نقطۂ نظر کا نہ یہ مفہوم ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ ہم یا عام مسلمان الیکشن سے ہر طرح ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائیں۔ الیکشن میں کب اور کس طرح حصہ لینا چاہیئے، یہ معنی نہیں رکھتا کہ الیکشن سے سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہ رکھی جائے، یہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں اور ہمارا مسلک پہلی بات کا متقاضی ہے نہ کہ دوسری بات کا۔ اور جب ہمارا نقطۂ نظر چند ضروری شرائط کی تکمیل پر الیکشن میں حصہ لینے کو جائز قرار دیتا ہے تو اگر مسلمان سرے سے اس سے دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیں اور وہ بھی خوف و ہراس یا مایوسی و مرعوبیت کی

بناپر تو صرف یہی نہیں کہ یہ ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق نہ ہوگا بلکہ اس سے آیندہ کی راہ بھی مسدود ہو جائیگی اور یہ واضح بات ہے کہ الیکشن سے الگ رہنے کا محرک کوئی ایسا جذبہ ہو جو ہمارے پیش نظر محرکات سے الگ اور مختلف ہے تو اسے ہم پسندیدہ کسی حال میں قرار نہیں دے سکتے۔ اسلئے ہم اپنے خاص مسلک کی بناپر بھی اس کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور رہتے۔

ان وجوہ سے جب اس الیکشن کے موقع پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے خوف وہراس اور مایوسی میں کمی واقع ہوئی ہے، ان کا جمود ٹوٹ رہا ہے، خواب سے بیدار ہو کر وہ کچھ انگڑائیاں بھی لینے لگے ہیں، اور ایک نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ میدان میں اترنے کے لئے آمادہ ہیں تو قدرتاً اس پر ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ ہم اسے ان کے مستقبل کے لئے ایک فالِ نیک سمجھتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ انشاءاللہ رفتہ رفتہ وہ دن بھی آئے گا کہ وہ اپنا اصل منصب ومقام پہچان لیں گے اور پھر اس کے حقیقی تقاضے بھی پورے کرنے میں لگ جائیں گے، جن پر نہ صرف ان کے اپنے مستقبل کا دارومدار ہے بلکہ خود ملک کی فلاح وبہبود بھی اسی پر موقوف ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کی اس نئی کروٹ پر دل سے انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا اتحاد

لیکن جہاں ہم مسلمانوں کی اس نئی کروٹ کا خیر مقدم کرتے ہیں، وہیں جذبۂ نصح وخیر خواہی کے تحت ہم اپنا یہ فرض بھی سمجھتے ہیں کہ اگر خواب سے بیدار ہونے پر بھی غفلت کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں، یا ان کی یہ کروٹ ابھی صحیح بیداری کے مفہوم سے ناآشنا ہے تو انھیں اس پر متنبہ کریں تاکہ آگے وہ جو بھی قدم اٹھائیں، صحیح سمت میں ہو اور وہ اپنی منزل کے قریب آسکیں نہ یہ کہ خدانخواستہ یہ بیداری بھی خوابِ غفلت ہی کا ایک تماشا نہ ثابت ہو اور وہ غیر شعوری طور پر کسی غلط راستہ پر پڑ کر اپنی اصل منزل سے اور زیادہ دور ہو جائیں۔

اس پہلو سے جب ہم حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو جو بات ہمیں سب سے پہلے قابلِ توجہ نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے جو مسلمان تو کہلاتے ہیں لیکن اسلام اور مسلمانوں کے اہم سے اہم مفاد سے بھی ان کو بس اتنی دلچسپی ہے کہ کسی مسلمان کی زبان پر اس

کا نام نہ آنے پائے اور اگر پھر کبھی کوئی اس کا نام لیتا ہے تو وہ ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ ایسے لوگ درحقیقت خوابِ غفلت میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ ان پر ملّی غیرت و حمیت کی مردنی چھا چکی ہے۔ اس لئے ان کی بیداری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کو چھوڑ کر بھی بیداری کی اس نئی لہر کے وقت بہ ظاہر بیدار ہونے والوں میں بھی اچھی خاصی بڑی تعداد میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سب کچھ سہی مگر مسلمانوں کو بھولے سے بھی کسی اتحاد یا تنظیم کا نام زبان پر بھی نہیں لانا چاہیے کہ اس سے ہندو فرقہ پرستی کو شہ ملے گی۔ اور مسلمانوں کو اس سے بڑا نقصان پہنچے گا۔ اور اپنے اس خیال کے تحت وہ اس بات کے بھی سخت مخالف ہیں کہ الیکشن سے فائدہ اٹھانے کے لئے بھی وہ بحیثیت ملّت کوئی بات سوچیں۔

ہمارے نزدیک یہ طرزِ فکر پچھلے دور کی مرعوبانہ ذہنیت کی باقیات السیئات کا ایک نمونہ ہے اور جو لوگ اور پہلوؤں سے اپنی بیداری کا کچھ نہ کچھ ثبوت پیش کر رہے ہیں لیکن اب تک اس طرزِ فکر کو انھوں نے اپنا رکھا ہے تو ان کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اتحاد ایک دینی ضرورت

ہمارے خیال میں امتِ مسلمہ کے اتحاد و تنظیم کا مسئلہ ایک ناگزیر دینی ضرورت کا سوال ہے کیونکہ ہم نے جس دین کو اختیار کیا ہے اس کا یہ ایک اولین مطالبہ ہے اور اس دین نے اپنے ماننے والوں کے سپرد جو خدمت کی ہے اس کی انجام دہی اتحاد و تنظیم کے بغیر ممکن بھی نہیں ہے اور ہندوستان کے وہ حالات جو درحقیقت مسلمانوں کی اس نئی کروٹ کے موجب ہو رہے ہیں بجائے خود اس ضرورت کو روز بروز ناگزیر سے ناگزیر تر بناتے جا رہے ہیں۔ اس لئے اس کے ضمن میں یہ سوال تو ضرور اٹھایا جا سکتا ہے، اور ہم خود بھی اس کے مؤید ہوں گے کہ یہ اتحاد و تنظیم

کس طرح اور کس مقصد کے لئے ہونی چاہیئے ۔ اور ملک کے یا خود مسلمانوں کے اپنے موجودہ حالات کے لحاظ سے اس کی کونسی شکل ممکن یا مناسب ہے اور کونسی نہیں، لیکن اس سے قطع نظر کرکے محض اس کے نام سے کان کھڑے کر لینا اور اس کی ہر صورت کو قابلِ مذمت یا ناممکن ٹھیرانا، صرف ان ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو ایک طرف یا تو دین اور اس کے تقاضوں سے ناواقف ہوں یا واقف ہوتے ہوئے بھی مصلحتِ وقت پر ان کو قربان کر دینا چاہتے ہوں اور دوسری طرف ان تمام واقعات وحوادث سے انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہوں جو تقسیم کے بعد ملک میں ایک خاص تسلسل سے پیش آرہے ہیں اور جن کی بدولت مسلمان اپنی عزیز سے عزیز متاع سے بھی محروم ہوتے چلے جارہے ہیں یا اگر وہ یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور پھر بھی چاہتے یہ ہیں کہ سب کچھ ہونے پر بھی مسلمان بس خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتے رہیں اور کچھ ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں، تو کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی غیرت وحمیت کو پسِ پشت ڈال کر کے مسلمانوں کو بھی اسی کا سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔

فرقہ پرستی کا ہوّا

رہا سوال فرقہ پرستی اور جوابی فرقہ پرستی کا، تو مسلمانوں میں کوئی احمق ہی ہوگا جو جان بوجھ کر فرقہ پرستی کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہو، کیونکہ فرقہ پرستی اس معنی میں جو اسے ایک گھناؤنی چیز قرار دیتی ہے، خود اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اور واقعۃً اس مفہوم میں اسے زندہ کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے نہ صرف ملک کو بلکہ بحالاتِ موجودہ خود مسلمانوں کو بھی سخت ترین نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا، چنانچہ انہی وجوہ سے ہم خود اس کے سخت خلاف ہیں لیکن فرقہ پرستی کا ہوّا کھڑا کرنے والوں کو یہ بات بھولنی نہیں چاہیئے کہ ہر فرقہ کے جو جائز حقوق ہیں ان کو حکومت یا اکثریت سے طلب کرنا یا ان کے تحفظ کی فکر و تدبیر کرنا فرقہ پرستی نہیں ہے۔ خود یہاں کے دستور نے یہ حقوق تسلیم کئے ہیں اور اس کی رو سے ہر فرقہ کو ان کے تحفظ کا پورا پورا حق حاصل ہے اور یہ فرض کر لینے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی فرقہ اپنے جائز حقوق کے لئے جائز حدود کے اندر رہ کر کچھ ہاتھ پاؤں ہلاتا

یا کوئی سعی و تدبیر کرتا ہے تو اس سے خواہ مخواہ غیر مسلموں میں اشتعال ہی پیدا ہوگا۔ اور وہ ہاتھ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جائیں گے اور اس طرح اس کے جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اکثریتی فرقہ میں ایسے لوگ یقیناً ہیں جو مسلمانوں کے اپنے کسی قصور کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے مزاج اور ذہنی ساخت کی بنا پر فرقہ پرستی میں مبتلا ہیں اور ایسے لوگ ان کے بے قصور ہونے پر بھی انہیں ہر وقت سزا دینے کے لئے آمادہ رہتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی پورے اکثریتی فرقہ کو اس درجہ غیر منصف اور جفا کار کیوں فرض کر لیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے جائز حقوق و مطالبات میں ان کا ساتھ دینے کی بجائے ان کے دشمن ہو جائیں گے۔ ان میں آخر وہ جمہوری اور سیکولر مزاج رکھنے والے لوگ بھی تو ہیں جن کا حوالہ اس نقطۂ نظر کے حامی اس طرح دیا کرتے ہیں کہ گویا وہی مسلمانوں کو فرقہ پرستوں کا لقمہ بننے میں روک رہے ہوئے ہیں۔ کیا واقعۃً یہ ایسے ہی لوگ ہیں کہ مسلمانوں کے جن حقوق کا تحفظ خود دستور نے بھی دیا ہوا ان کو حاصل کرنے کے لئے وہ بالکل جائز اور آئینی طریقے بھی اختیار کریں تو بھی وہ مشتعل ہو جائیں گے؟ پھر ان میں اور جن کو فرقہ پرست کہا جاتا ہے آخر فرق کیا ہوگا اور خود ان فرقہ پرستوں سے ڈر کر آخر مسلمان کہاں تک اور کب تک سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہیں گے۔ اور اپنے بقاء و تحفظ کا مسئلہ دوسروں کے حوالہ کر دینگے جبکہ ان کی روش یہ ہے کہ جو مسلمان فرقہ پرستی پر ہر روز ہزار بار لعنت بھیجتے ہیں اور اس کے الزام سے بچنے کے لئے سو طرح کے جتن کرتے ہیں وہ بھی ان کی نگاہ میں فرقہ پرست ہی ہیں، اور اس وقت تک رہیں گے جب تک وہ اپنا نام اور صورت بھی ان کی مرضی کے مطابق تبدیل نہ کر دیں اور پھر تقسیم کے بعد اب تک مسلمانوں کی عام روش بھی تو رہی ہے کہ اپنے حقوق کے لئے کسی اجتماعی جد و جہد کا نام بھی نہ لیں۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا اور کہاں تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے پھر کیوں نہیں وہ اس کی بجائے کوئی دوسری راہ خواہ بطور تجربہ ہی کیوں نہ ہو اختیار کریں؟ اور ایسی راہ جس سے ان کے تحفظ کا مقصد بھی پورا ہو سکے اور جو اُن کے حقیقی مزاج اور دینی تقاضوں کے مطابق بھی ہو، ہمارے نزدیک کچھ شرطوں کے ساتھ

ان کے اتحاد وتنظیم ہی کی راہ ہو سکتی ہے اور ان شرطوں کی رعایت کے ساتھ ان کا اتحاد و تنظیم ملک کے لئے بھی خیر و برکت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ جس کی کچھ تشریح انشاء اللہ آگے آئے گی۔

اتحاد کے بارے میں کچھ شکوک

مسلمانوں کے اتحاد وتنظیم کے سوال پر جو شکوک اور اندیشے مخالفین کی طرف سے عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں ان کا مختصر جواب اوپر عرض کر دیا گیا ہے۔ اور چونکہ اس طرح کے شکوک اور اندیشے اب کچھ مخصوص حلقوں ہی تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور عام مسلمان ان سے یکسو ہو کر اب کچھ آگے کی باتیں سوچنے لگے ہیں اس لئے ان پر مفصل بات چیت کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن ابھی حال میں ایک خاص طبقہ کے ایک ذمہ دار نے اپنے ایک طویل انٹرویو میں اس موضوع پر کچھ اس انداز میں گفتگو کی ہے جس سے اس کے بعض گوشوں کے بارے میں کم از کم ناواقف حال لوگوں کو کچھ اشتباہ پیش آسکتا ہے اس لئے اس پر گفتگو کے لئے آپ کا کچھ تھوڑا وقت اور لینا چاہتے ہیں۔

سوال کیا گیا تھا کہ:۔

"موجودہ سیاسی حالات میں مسلمانوں کو متحد کر کے اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا کیا ملت کی اہم ضرورت نہیں ہے"؟

اس کے جواب میں ذمہ دار مذکور نے بقول نامہ نگار ایک آہ سرد بھر کر اور نہایت درد انگیز لہجہ میں فرمایا:

"اتحاد! کتنا خوش کن جاذب توجہ لفظ ہے کون مسلمان ہوگا جو اتحاد بین المسلمین کی تمنا نہ رکھتا ہو۔ لیکن ایک تو ہوتی ہے تمنا اور ایک ہوتا ہے اس تمنا کا وقوع پذیر ہونا۔ خواب تو بڑے اچھے اچھے اور اونچے دیکھے جا سکتے ہیں لیکن ہر خواب کا شرمندۂ تعبیر ہونا ضروری نہیں"۔

ان جملوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ باعتبار اصل اتنی صحیح اور سچی بات ہے کہ اگر اسے ایک بیش یا افتادہ حقیقت کی تعبیر کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کس کو اس بارے میں شبہ ہو سکتا ہے کہ ہر خواب کا خواہ وہ کتنا ہی شیریں کیوں نہ ہو، شرمندۂ تعبیر ہونا ضروری نہیں ہے لیکن مذکورہ سوال کے جواب میں یہ صحیح اور سچی بات انھوں نے کچھ اس انداز میں کہی ہے کہ اس سے بآسانی یہ مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے کہ موصوف کے نزدیک اتحاد بین المسلمین کی تمنا ایک ایسے ہی خواب شیریں کی حیثیت رکھتی ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہے تو لگی لپٹی کیوں رکھی جائے۔ کیوں نہیں صاف صاف اعلان کر دیا جائے کہ یہ تمنا جس میں ہر مسلمان مبتلا ہے اور یقیناً ان میں موصوف بھی داخل ہوں گے محض ایک جنون یا خللِ دماغ ہے۔ اور پہلے اپنے ذہن و دماغ کو اس جنون سے پاک کر لیا جائے اور پھر مسلمانوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ بھی جلد از جلد اس سے اپنا ذہن و دماغ صاف کر لیں۔ یقیناً یہ ان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ بلکہ اس تصور کے تحت تو شاید اس وقت مسلمانوں اور ملک کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوگی کہ سب کام چھوڑ کر سب سے پہلے انھیں اس جنون سے نکالنے کی کوشش کی جائے کیونکہ یہ اس جنون ہی کا تو شاخسانہ ہے کہ ان کی طرف سے آئے دن اتحاد و اتفاق کی باتیں اٹھتی رہتی ہیں جن سے سیکولرزم اور قومی یک جہتی وغیرہ کو جو ملک و ملت کی نجات کے ضروری وسائل ہیں صدمہ پہنچتا ہے!

اتحاد یا تفرق بین المسلمین

اور اگر یہ سچی بات محض اس تمنا کے وقوع پذیر ہونے کی دشواریوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہی گئی ہے تو تنہا یہ اشارہ کر دینا کافی نہ تھا ایک ایسی تمنا جس کی عمومیت اور ہمہ گیری کا انھیں خود اعتراف ہے اس بات کی ضرور متقاضی تھی کہ جہاں انھوں نے اس کے حصول کے دشوار ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہیں کچھ اس پر روشنی ڈالی ہوتی کہ اس کی کوئی ایسی شکل بھی ہے جو موصوف کے نزدیک بھی شرمندۂ تعبیر ہو سکتی ہے، اور اس کا جو طریقہ ان کے خیال میں مناسب اور موزون

ہوسکتا ہے کچھ اس کی بھی نشاندہی فرمائی ہوتی۔ بحالاتِ موجودہ جب اس پر انھوں نے کوئی گفتگو نہیں فرمائی ہے اور آگے انٹرویو میں انھوں نے جابجا مسلم جماعتوں پر نام لے لے کر کیچڑ اچھالنے کی کوشش ہے اور جماعت اسلامی کو تو خاص طور سے اپنا تختۂ مشق بنایا ہے تو اس سے تو کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے نزدیک شاید اتحاد بین المسلمین کی تمنا اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہوسکتی ہے جب یہ تمام جماعتیں اپنا اپنا وجود ختم کر کے ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوجائیں۔ اور اس تمنا کے حصول کی سب سے بہتر تدبیر غالباً یہ ہے کہ جن جماعتوں سے تھوڑا بہت اختلاف ہو انھیں خوب جی بھر کر برا بھلا کہا جائے۔

آپ خود سوچیں کہ اتحاد بین المسلمین کا نام سن کر آہِ سرد بھرنے والے بزرگ جب اتحاد کی عملی تدبیر کی کوئی نشاندہی تو نہ کریں اور مثلاً جماعت کی دعوت کی نوعیت، اس کی شائع شدہ پالیسی اور پروگرام اور اس کی عملی سرگرمیوں اور پچھلے تاریخی ریکارڈ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اس پر یہ الزام لگانے پر اتر آئیں کہ:

"وہ اکثریتی فرقہ سے منافرت اور دشمنی کی بنیاد پر کام کرنا چاہتی ہے"

اور اس بے بنیاد الزام کے لئے کوئی ثبوت انھیں نہ مل سکے تو اس کے ثبوت کے طور پر وہ یہ دوسرا بے بنیاد الزام اس کے سر تھوپ دیں کہ:

"جو جماعت مسلمانوں سے اخلاص، محبت اور بھائی چارہ کا معاملہ نہیں کرسکتی وہ جماعت غیر مسلموں سے کیا رواداری برت سکتی ہے"

اور ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی باتیں اس کی طرف بے جھجک منسوب کرجائیں جن کا واقعات کی دنیا میں کوئی ثبوت نہ ہو تو یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کا یہ اسوۂ حسنہ ہی اتحاد بین المسلمین کا اصلی اور کارگر نسخہ ہے!

اب آگے بڑھئے۔ مذکورہ استفسار کے جواب میں مزید انھوں نے ارشاد فرمایا:

"کسی اچھی بات پر مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے سے کسے انکار

ہو سکتا ہے لیکن دیکھنا یہ چاہیئے کہ مسلمانوں کو اسلام کے نام پر جمع کر کے ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کرنا اس آزاد ہندوستان میں ممکن ہے یا نہیں۔ جذبات کو ابھار کر مسلمانوں کو بڑی آسانی سے جمع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن منافرت اور مشتعل جذبات کے ساتھ جو جماعت تشکیل ہوگی وہ غیر مسلموں کو بھی مشتعل کر دے گی، وہ غیر مسلم بھی متاثر ہوں گے جو آج فاسد دماغ نہیں رکھتے، بلکہ جمہوری اور سیکولر ذہن رکھتے ہیں۔ اس طرح فرقہ وارانہ تعصب ہی کو شہ ملے گی اور کوئی خاص فائدہ اس ملک اور مسلمانوں کو نہ ہوگا۔"

جواب کا یہ ٹکڑا ابھی پہلے ہی ٹکڑے کے مشابہ ہے۔ یعنی ایک سانس میں تو کسی اچھی بات پر مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ہے کہ وہ ایک محمود اور پسندیدہ کام قرار پاتا ہے لیکن دوسری ہی سانس میں گویا اسے بھی ایک ایسا ہی خوابِ تیریں قرار دے دیا گیا ہے جو منت کشِ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اور پہلے کی طرح یہاں بھی یہ بتانے کی زحمت نہیں اٹھائی گئی ہے کہ اگر مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی وہ صورت غلط یا ناممکن ہے جس پر انھوں نے گفتگو فرمائی ہے تو وہ تو زیادہ سے زیادہ اس کی صرف ایک صورت ہے، اسے چھوڑ کر انھیں یہ بتانا چاہیئے تھا کہ ان کے خیال میں اس محمود کام کے وقوع پذیر ہونے کی اور کوئی مناسب یا ممکن شکل ہے یا نہیں۔ اس سوال پر انھیں کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت خاص طور سے اس لیے بھی تھی کہ سائل نے اتحاد کی کسی متعین شکل کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا بلکہ اس نے ایک مجموعی انداز میں یہ دریافت کیا تھا کہ:

"موجودہ سیاسی حالات میں مسلمانوں کو متحد ہو کر اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا کیا ملّت کی اہم ضرورت نہیں ہے؟"

اس لیے حلِ مسائل کی ایک متعین شکل لے کر اسے نامناسب یا ناممکن ٹھہرا دینے سے اس سوال کے جواب کا حق ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ سائل کی اتنے ہی جواب سے تسکین

ہوگئی ہو۔ جیسا کہ اس کی خاموشی سے ظاہر ہوتا ہے یا عجب نہیں کہ وہ خود بھی اتنے ہی جواب کا خواہش مند رہا ہو جو اسے ملا۔ کیونکہ اس کے اور سوالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے انٹرویو کا خاص مقصد موصوف کو اس کا موقع فراہم کرنا تھا کہ وہ اس کی خواہش کے مطابق کچھ جماعتوں یا ان کی کوششوں کو برا بھلا کہہ سکیں۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ سوال کے منشار کے مطابق مسلمانوں کے مسائل کو متحد ہو کر حل کرنے کے سلسلہ میں کچھ حلقوں کی طرف سے جو متعین صورتیں تجویز کی جارہی ہیں اور جن کے مطابق کچھ عمل بھی ہو رہا ہے ان سے تو تعرض نہیں کیا گیا اور بحث کے لئے اس کی وہ صورت سامنے رکھ لی گئی جو ہمارے علم و اطلاع کی حد تک کم از کم تاحال تو محض ایک مفروضہ ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ایسے سر پھرے کہاں ہیں جو مسلمانوں کو اسلام کے نام پر جمع کر کے کوئی سیاسی جماعت تشکیل دینا چاہتے ہوں؟ ہاں ماضی میں کچھ ایسی بزرگ ہستیاں ضرور گذری ہیں جن کے سامنے یہ مقصد کسی نہ کسی درجے میں رہا ہے لیکن وہ اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں اور اب تو ان کے نام لیواؤں کے لئے اس حیثیت سے ان کا تعارف بھی ناگواری کا موجب ہو جاتا ہے۔

اور اس مفروضہ میں یہ فرض کر لینا بھی ایک نہایت عجیب بات ہے کہ اسلام کے نام پر کسی سیاسی جماعت کی تشکیل کی کوئی کوشش عمل میں لائی جائے گی تو وہ لامحالہ اس کے نام کا غلط استعمال ہوگا۔ جیسا کہ سیاقِ کلام سے واضح ہوتا ہے یا اسلام کے نام پر کسی سیاسی جماعت کی تشکیل اس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکایا یا انھیں غیر مسلموں کے خلاف مشتعل کر دیا جائے۔ کیا اسلام اس صلاحیت سے محروم ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکائے بغیر وہ اپنے گرد مسلمانوں کو جمع کر سکے یا مسلمان اس سے اس درجہ بے تعلق یا بے گانہ ہو چکے ہیں کہ اب انھیں اس کے نام پر اکٹھا کرنے کے لئے ان کے جذبات کو بھڑکانا بھی ضروری ہے۔ اور کیا اسلام ایسا ہی مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کے جذبات

کہ غیر مسلموں کے خلاف بھڑکا دینے کو ضروری ہی قرار دیتا ہو۔ اور غیر مسلم ہر حال میں اسلام کے نام پر کسی سیاسی جماعت کی تشکیل پر مشتعل ہی ہو کر رہیں؟ غرض ہمارے نزدیک یہ بات محض ایک مفروضہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں کسی حلقہ کی طرف سے اسلام کے نام پر کوئی سیاسی جماعت تشکیل دی جارہی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس مقصد کے لیے مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکا کر انھیں غیر مسلموں کے خلاف صف آرا کر دیا جائے اور اگر یہ بات یہ فرض کر کے کہی گئی ہے کہ مسلم مجلسِ مشاورت یہ کام کرنے جارہی ہے یا جماعت اسلامی اس کے لئے پہلے سے کوشاں ہے یا اب اس پر یہ سودا سوار ہوا ہے تو پہلے جماعت اسلامی کے سلسلہ میں موصوف کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا نصب العین اقامت دین ہے جس کے مخاطب مسلم اور غیر مسلم دونوں ہیں۔ اور اس کا اپنا ایک مخصوص طریقہ کار ہے جو اس مقصد کی مناسبت سے کتاب و سنت کی روشنی میں اختیار کیا گیا ہے جس میں خود یہ صراحت موجود ہے کہ:

> "جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہوگی اور کبھی ایسے ذرائع اور طریقے استعمال نہ کرے گی جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رونما ہو۔"

اس لیے یہ بات اس کے مقصد و طریق کار سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتی کہ اسلام کے نام پر مسلمانوں کے جذبات بھڑکا کر ان کی کوئی سیاسی پارٹی کی تشکیل دی جائے اور دنیا جانتی ہے کہ اس جماعت کی اکثریت پڑھے لکھے اور صاحبِ فہم افراد پر مشتمل ہے اور ایسے لوگوں کے بارے میں یہ فرض کر لینا ہرگز عقل مندی کی بات نہ ہوگی کہ وہ ہندوستان اور خود مسلمانوں کی موجودہ حالت سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس طرح کے کسی خبط میں مبتلا ہو جائیں گے ہاں بلاشبہ ہم مسلمانوں کو متحد کرنے کے قائل ہیں اور اس کے لئے کوشاں ہیں لیکن اسلام کے نام پر

نہیں بلکہ اس کی بنیاد پر اور اس سے ہمارا مقصد انھیں اقامت دین کے لئے آمادہ کرنا ہے نہ کہ ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے، ان کی کوئی سیاسی پارٹی قائم کرنا اور یہاں میں اس بات کی وضاحت کردینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اقامت دین کا نصب العین سیاست سے بالا بالا ہو کر نہیں گذرتا ہے۔ ہم نے جس دین کو قائم کرنا اپنا نصب العین ٹھہرایا ہے، اس کے بارے میں دوسروں کا جو بھی تصور ہو لیکن ہمارے اپنے نقطۂ نظر سے اس میں دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی وہ تفریق نہیں پائی جاتی جس کی دوسرے مذہبوں میں گنجائش ہو سکتی ہے یا جس کے جمہوریت اور سیکولرزم کے بہت سے علم بردار قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک تو اس کا جوڑ پارلیمنٹری سیاست سے بھی لگ سکتا ہے لیکن ابھی عملاً ہمارے لئے اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہم اس کے لئے کچھ شرطیں ضروری سمجھتے ہیں جو ابھی پوری نہیں ہو سکی ہیں۔ اور پھر ہم اقامت دین کے متعدد اجزا میں ترتیب ملحوظ رکھنے کے بھی قائل ہیں اور اس ترتیب کی رو سے تشکیلِ سیاست کے مسائل سے دل چسپی لینے سے مقدم کام ہمارے نزدیک فرد کی اصلاح اور معاشرہ کی تعمیر کا کام ہے اور انہی وجوہ سے ہم ابھی اسے بھی قبل از وقت سمجھتے ہیں کہ ہمارے ارکان الیکشن میں ووٹ دینے کی حد تک بھی حصّہ لیں۔

اب جہاں تک مسلم مجلس مشاورت کا تعلق ہے تو ہمیں نہیں معلوم کہ اس طرح کا کوئی کام اس کے پیش نظر ہے یا اس کی تشکیل جس طرح ہوئی ہے یا جن مقاصد کو وہ اہمیت دیتی ہے ان کے پیش نظر آئندہ بھی وہ اس طرح سوچ سکتی ہے اور اگر خدانخواستہ وہ ایسا کرے گی تو وہ مسلم مجلس مشاورت نہ ہوگی کچھ اور ہوگی۔ رہا اس کا یہ فیصلہ کہ وہ اپنے شائع کردہ کچھ نکات کے حق میں بلا تفریق مذہب و ملت ملک کی رائے عامہ ہموار کرنا چاہتی ہے تو اس کی اتنی سی بات کو وہ معنی کس طرح پہنائے جا سکتے ہیں جو جواب میں فرض کر لئے گئے ہیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس فیصلہ کے اگلے قدم کے طور پر جو صورتیں بھی فرض کرلی جائیں

کسی سے بھی وہ معنی نہیں نکل سکتے۔ اور ابھی تو اس بارے میں انتظار کی ضرورت ہے کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔

مذکورہ بالا انٹرویو میں اس سوال کے جواب میں بھی کہ "ان کی جماعت الیکشن میں مسلمانوں کی کیا رہنمائی کرے گی" کچھ ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو مسئلۂ زیر بحث یعنی مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان پر بھی کچھ گفتگو کرلی جائے۔ اس لئے نہیں کہ وہ باتیں بجائے خود بڑی اہم ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ بہرحال ایک مخصوص حلقۂ فکر کی ترجمانی کرتی ہیں اور بہت سے لوگ جن کو ان مسائل پر غور و فکر کا زیادہ موقع نہیں مل سکا ہے ان سے اشتباہ و تردد میں مبتلا ہو سکتے ہیں لیکن ان باتوں پر گفتگو کرنے سے پہلے یہاں یہ اصولی سوال طے کرلینا بھی کچھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ان مسائل پر اظہارِ خیال کا حق بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔

ہمارے اس سوال سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ خدانخواستہ ہم اس کے خلاف ہیں کہ وہ ان مسائل پر کوئی رائے زنی کریں۔ ہمارے نزدیک ہر فرد و جماعت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جس مسئلہ پر جو بھی رائے رکھتا ہو اس کا اظہار کرے بلکہ ہم تو اسے اس لحاظ سے بہت زیادہ پسندیدہ سمجھتے ہیں کہ مختلف نقاطِ نظر کے سامنے آنے پر کھل کر ان پر گفتگو ہو سکتی ہے اور اس طرح باتیں زیادہ صاف اور منقح شکل اختیار کر سکتی ہیں۔ ہمارے سوال کا منشا دراصل یہ ہے کہ اس انٹرویو میں انھوں نے جو باتیں کہی ہیں یا اپنی جماعت کا جو موقف واضح کیا ہے اس کی رو سے وہ اس جماعت کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت میں ان مسائل پر اظہارِ خیال کے مجاز ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ سوال کیوں اور کس طرح پیدا ہوتا ہے، اس کی تشریح آگے آتی ہے۔

ان سے سوال کیا گیا تھا کہ "الیکشن میں ان کی پارٹی مسلمانوں کی کیا رہنمائی کریگی؟" انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ "الیکشن ان کی جماعت کا موضوع نہیں ہے" اور پھر یہ کہہ کر

گویا اس جواب کو اور زیادہ مؤکد کیا گیا ہے کہ :-

"اگر ہم الیکشن بازی میں پڑیں اور مسلمانوں کی جماعتی حیثیت سے اس قسم کی رہنمائی کرنے لگیں تو اس ملک میں ہمارے لئے قوم کی اتنی خدمت کرنا بھی مشکل ہو جائے گا جتنی ہم اب کر رہے ہیں ۔"

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ الیکشن میں پڑنا یا الیکشن میں مسلمانوں کی کوئی رہنمائی کرنا، اس جماعت کے لئے ایک خارج از بحث موضوع ہے۔ لیکن پہلے تو اس مؤکد کرنیوالی بات ہی کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خود اس سے پہلی بات کی نفی نہیں ہوتی ہے؟ کوئی جماعت الیکشن میں یا اس میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے سے الگ رہ سکتی ہے، وہ اپنے بارے میں ہر طرح کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ لیکن اگر اس کا بیان کسی خاص سیاق میں اس طرح ہو کہ اس سے یہ مترشح بھی ہو رہا ہے کہ وہ بات دوسروں کے لئے بھی قابل تقلید ہے، جس سے یہ مفہوم بھی لازماً نکلے گا کہ اس سے الگ جو طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں، غلط ہیں، تو یہ تو ایک طرح سے الیکشن یا ایک سیاسی مسئلہ میں مسلمانوں کو رہنمائی دینے ہی کے مترادف ہو گیا جس سے پہلے فقرہ میں تبری کی گئی ہے!

پھر آگے تو متعدد سیاسی مسائل پر صاف صاف گفتگو کی گئی ہے جسے طویل ہونے کے باوجود ہم یہاں من وعن نقل کر رہے ہیں تاکہ پوری بات سامنے آجائے اور آگے ان نکات پر گفتگو کے وقت حوالہ میں بھی آسانی ہو۔

"اگر ہم مسلمانوں کی الگ پارٹی بنا کر مسلمانوں کے ووٹ فرقہ وارانہ بنیاد پر حاصل کرنے کی کوشش کریں تو یہ ہر اعتبار سے غلط ہے۔ کیونکہ اگر اکثریت کی فرقہ واریت غلط ہے تو آپ کو بھی فرقہ واریت کا حق نہیں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ مسلمانوں کی تنظیم بنا کر سیاسی پارٹیوں سے معاہدے کر لئے جائیں اور ان پر زور ڈالا جائے کہ تم ہمارے مطالبات پورے کرو تو ہم تمھیں مسلم ووٹ

دلائیں گے، میرے خیال میں یہ بھی مسلمانوں کے لئے مفید نہیں، ایک تو اس وقت سب جماعتیں ہر چیز کو مان لیں گی لیکن پھر عمل نہ ہو گا۔ دوسرے ہماری جماعت ابھی تو ہر جماعت سے مسلمانوں کا کام لے لیتی ہے، کمیونسٹوں کے پاس جاتی ہے اور کہتی ہے کہ دیکھو اردو کے ساتھ یہ زیادتی ہو رہی ہے تم ہمارے ساتھ اردو کی جد و جہد میں شرکت کرو۔ کمیونسٹ بلا چون وچرا ہمارے ساتھ آجاتے ہیں اور مسلمانوں کے مفادات اور مسائل کو حل کرانے میں پورا حصہ لیتے ہیں۔ ہم کانگریس کے پاس جاتے ہیں (اپنی) جماعت کی قربانیاں یاد دلاتے ہیں، اور ان سے کہتے ہیں کہ ہمارے یہ مطالبات پورے کرو۔ مجھے تسلیم کہ کانگریس مسلم مطالبات پورے طور پر حل نہیں کرتی لیکن جو کچھ کرتی ہے وہ اس غیر جانبداری ہی کا نتیجہ ہے۔ بالفرض ہماری جماعت کسی جماعت سے معاہدہ کرے تو دوسری سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کی اور جماعت کی مخالف ہو جائیں گی اور مسائل سلجھنے کے بجائے اور الجھ جائیں گے"۔

عبارت بالا کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس میں الیکشن سے براہ راست تعلق رکھنے والے مسائل پر گفتگو کر کے مسلمانوں کو ان کے بارے میں ایک رہنمائی دی گئی ہے اور جب ایسا ہے تو پھر جواب کے اول حصہ میں الیکشن سے الگ رہنے اور اس کے بارے میں مسلمانوں کی کوئی رہنمائی نہ کرنے کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے اس سے اس کا جوڑ کس طرح لگ سکتا ہے؟

اور یہ سوال یہیں ختم نہیں ہو جاتا ہے، آگے اس انٹرویو میں مزید جو باتیں کہی گئی ہیں ان سے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی اپنی باتوں کا تو کیا سوال، ان کی تشریح کے مطابق اس جماعت نے بحیثیت جماعت جو فیصلہ کیا ہے خود اس کے بارے میں بھی بعینہٖ تضاد کا یہی سوال پیدا ہوتا ہے۔

آگے کے جملے یہ ہیں:

"اسی لئے (ہماری جماعت) نے طے کر لیا ہے کہ جو شخص جس سیاسی پارٹی کو مناسب سمجھے اس کا ساتھ دے۔ ملکی سیاست میں حصہ لینا ہر شخص کا نجی معاملہ ہے جو امیدوار مسلم مفادات کے لئے کار آمد نظر آئے خواہ وہ کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑا ہو یا کمیونسٹ، پرجا سوشلسٹ، سوتنتر پارٹی وغیرہ کے ٹکٹ پر، اس کو ووٹ دیا جائے۔ البتہ فرقہ وارانہ جماعتوں کو ووٹ نہ دیا جائے یہ (جماعت) کا پیغام ہے"۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ووٹ دینے یا نہ دینے کے سلسلہ میں کچھ قیدوں کی رعایت کرنے اور ملکی جماعتوں میں ان کی نوعیت کے اعتبار سے فرق کرنے کا مشورہ دینا بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ جماعت الیکشن کے بارے میں مسلمانوں کو کچھ مشورہ دیتی ہے اور آئندہ بھی دیتی رہے گی، کیونکہ حالات کی تبدیلی سے اس مشورہ میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کی ضرورت بہرحال پیش آسکتی ہے اور آخری فقرہ تو صاف واضح کر رہا ہے کہ وہ الیکشن کے سلسلہ میں مسلمانوں کو جو مشورہ دے رہی ہے اسے اس کے "پیغام" ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ پھر الیکشن سے اس کے علٰحدہ رہنے اور اس کے سلسلہ میں مسلمانوں کی کوئی رہنمائی نہ کرنے اور ملکی سیاست میں حصہ لینے کو ہر شخص کا نجی مسئلہ قرار دینے کے کیا معنی ہیں؟ ہو سکتا ہے ان حضرات کے نزدیک ان دونوں باتوں میں تطبیق کی کوئی شکل ہو جو اگر سامنے آئے تو ہم بھی اس پر غور کر سکتے ہیں لیکن بحالاتِ موجودہ تو دونوں باتیں ساتھ ساتھ ہمیں ایک معمہ ہی نظر آتی ہیں جو ہمارے خیال میں دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ ہی سے حل ہو سکتا ہے۔ یا تو اس طرح کہ یہ لوگ اپنے اس اعلان کو کالعدم قرار دے دیں کہ الیکشن ان کے موضوع سے خارج ہے اور اس کے بارے میں وہ مسلمانوں کی کوئی رہنمائی نہیں کرنی چاہتے ہیں یا اس طرح کہ اس اعلان کا جو تقاضا ہے اپنا عمل بھی پوری طرح اس کے

مطابق بنالیں لیکن یہاں اپنا یہ احساس بھی ہم صفائی سے عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی فیصلہ کرنا ان حضرات کے لئے کوئی آسان بات نہیں ہے اور اس وقت تک اس صورت حال کے باقی رہنے کی غالباً یہی اصل وجہ ہے۔

یہ فیصلہ کیوں آسان نہیں ہے ؟ یہ ایک تفصیل طلب بات ہے اور اس میں یہ نزاکت بھی ہے کہ اس کے جواب میں ہم جو کچھ عرض کریں گے، وہ ممکن ہے ان میں سے بہتوں کے لئے ناگواری کا موجب ہو لیکن اسلام اور مسلمانوں اور خود ان کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس بارے میں اپنی باتیں صاف صاف عرض کر دیں۔ اس لئے اختصار کے ساتھ وہ دفعہ وار عرض ہیں :-

۱۔ تقسیم کے بعد آزاد کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے فیصلہ کے تحت اس جماعت نے صحیح یا غلط طور پر یہ فیصلہ کرنے کو تو کر لیا ہے کہ اپنا دائرۂ کار مذہب کے دائرہ تک محدود رکھے اور سیاست سے کنارہ کش ہو جائے۔ لیکن اس جماعت کے عام شرکار بالخصوص اس کے علمار کم از کم نظری طور پر مذہب و سیاست کی تقسیم پر کبھی دل سے راضی نہیں ہو سکتے اس لئے اس کا اثر لامحالہ ان کے فکر و عمل پر بھی پڑے گا اور اس بنا پر اس فیصلہ سے انحراف کی باتیں بھی ظہور میں آتی رہیں گی۔ پھر جو جماعت تقسیم سے پہلے سیاست میں سرگرم حصہ لیتی رہی ہے اور الیکشن اس کے افراد کا گویا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ان کے لئے الیکشن سے الگ ہو کر کسی تعمیری کام میں لگ جانا اور اس تنگ دائرہ میں اپنے کو محدود کر لینا بھی کوئی آسان بات نہیں ہے اور غالباً اس "مجبوری" کو بھی جماعت کے اس فیصلہ میں بڑا دخل ہو گا۔ کہ وہ خود تو سیاست اور الیکشن سے علحدہ رہے گی۔ لیکن جماعت جن افراد سے بنتی ہے ان کو اس کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ ذاتی طور سے فرقہ وارانہ جماعتوں کو چھوڑ کر جس جماعت میں چاہیں شریک ہو کر ملک و ملت کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

۲۔ تقسیم سے پہلے اس جماعت کے سیاسیات میں حصہ لینے کا خاص رُخ یہ رہا ہے کہ اس میں اور کانگریس میں کوئی ایک گویا ایک دوسرے کا استاد یا شاگرد ہے اور آزادئ ملک کی وہ اس درجہ شیدائی رہی ہے کہ تحریکِ آزادی میں اپنی شرکت کو کسی شرط سے داغدار بنانے کی وہ کبھی روادار نہیں ہوئی، بلکہ جب مسلمانوں کے دوسرے حلقوں کی طرف سے یہ آواز اٹھائی گئی کہ آزادی سے پہلے ان کے حقوق کا مسئلہ طے ہو جانا ضروری ہے تو اس نے شدومد کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس بات کو اس مرحلہ میں چھیڑنے سے تحریکِ آزادی میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور یہ مسئلہ آزادی حاصل ہو جانے پر خود بخود اطمینان بخش طور پر طے ہو جائے گا لیکن آزادی کے بعد، اسباب خواہ کچھ بھی ہوں مسلمانوں کو ایک ایسی حالت سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے جس کا تصور بھی اس وقت ان کے خواب وخیال میں نہ آیا ہوگا۔ اس کا ردِعمل ان پر اگر ایک طرف اس شکل میں برآمد ہوا ہے کہ ان پر یہ جھنجلاہٹ طاری ہے کہ مسلمانوں نے ان کی بات نہیں مانی اور پاکستان قائم کر کے خواہ مخواہ ایک مصیبت مول لے لی تو دوسری طرف قدرتاً مسلمانوں کے اس حالِ زار سے وہ پریشان اور مضطرب بھی ہیں اور چونکہ بدلے ہوئے حالات میں ایک خاص تبدیلی یہ بھی ہوئی ہے کہ جداگانہ طریقِ انتخاب ختم کر کے اس کی جگہ مخلوط طریقِ انتخاب رائج کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے کسی بھی مسلم جماعت کے لئے الیکشن میں براہ راست حصہ لے کر کامیابی حاصل کرنے کا بہت کم امکان باقی رہ گیا ہے اس لئے اس جماعت کے نزدیک مسلمانوں کے دکھ درد کے مداوا کی اس کے سوا اب کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی ہے کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے دوسری پارٹیوں کا رخ کریں اور چونکہ اس مدت میں کانگریس کے رویہ کے وہ خود بھی کافی شاکی ہو چکے ہیں اور دوسرے مسلمان تو شکایت میں ان سے کہیں زیادہ آگے ہیں۔ اس لئے اب انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کے بڑے بڑے لیڈر خواہ کانگریس ہی کا بدستور ساتھ دیتے رہیں لیکن دوسروں کے لئے اور

پارٹیوں میں بھی شرکت کا دروازہ کھول دیا جائے بجز فرقہ وارانہ پارٹیوں کے جن کے ہاتھوں مسلمانوں کو طرح طرح کے کھلے ہوئے نقصانات پہنچ رہے ہیں۔

۳۔ اوپر کی دونوں باتوں سے اس جماعت کے موجودہ موقف اور اس کے اسباب کا کچھ نہ کچھ ضرور اندازہ ہو گیا ہو گا لیکن ہمارے نزدیک اس کے موقف پر ان باتوں سے بھی زیادہ جو بات اثر انداز ہو رہی ہے اور جس نے اس موقف کو اس وقت خاص طور سے دو رخا بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے اس نے صرف آزادی کی جد و جہد میں کانگریس کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ اس کے سامنے ملک کے مستقبل کی تعمیر کا جو نقشہ تھا اُسے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کر لیا تھا کیونکہ اس وقت اس کی تفصیلات پوری طرح واضح نہیں تھیں اور نہ ان پر غور کرنے کی انھیں فرصت و ضرورت تھی لیکن اب جبکہ وہ نقشہ رفتہ رفتہ عمل میں منتقل ہونے لگا ہے تو اسے دیکھ کر وہ حیران و ششدر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس وقت وہ اس پر مگن تھے کہ انھوں نے دوسرے تنگ نظر مسلمانوں کی طرح فرقہ پرستی کی راہ اختیار نہیں کی ہے اور وہ نیشنلسٹ ہیں۔ کیونکہ نیشنلزم کے معنی ان کے ذہن میں بس اتنے ہی تھے کہ نیشنل کانگریس کے ساتھ مل کر انگریزوں کی غلامی سے ملک اور مسلمانوں کو نجات دلائی جائے۔ لیکن آزادی کے بعد جب اس کی عملی تعبیر سامنے آنے لگی تو اب ان کو اس کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا ہے کہ نیشنلزم اتنی سادہ سی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستقل فکر و فلسفہ ہے جس کی بنیاد مغرب کے اس تصور پر قائم ہے کہ زندگی کے مسائل مافوق الطبیعی تصورات کے اثر سے آزاد ہو کر محض عقل کی روشنی میں طے کئے جانے چاہئیں اور اس بنا پر اس کے کچھ ایسے تقاضے بھی ہو سکتے ہیں جو مذہب سے ٹکراتے ہوں۔

اسی طرح اس وقت تو ان کی نگاہ میں جو کچھ اہمیت تھی بس اس کی تھی کہ ملک میں قومی اتحاد قائم ہو، کیونکہ آزادی کا یہ پہلا زینہ تھا اور اس بنا پر وہ متحدہ قومیت کی شد و مد کے ساتھ تائید کر رہے تھے اور ان کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کی کوئی ایسی تعبیر

بھی ہو سکتی ہے جس سے مسلمانوں کی مخصوص ملی حیثیت اور خصوصیات کو کوئی خطرہ پیش آسکے لیکن اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس کی ایک تعبیر یہ بھی ہے۔

اس صورت حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ اور یہی بات اس جماعت کے شایان شان بھی تھی کہ جدید حالات کی روشنی میں وہ اپنے پورے موقف پر غور کرتی اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے کی بجائے صحیح معنوں میں خود اسلام کو اپنا حقیقی رہنما بنا کر اپنے مقصد و طریق کار کی از سر نو تعیین کرتی۔ لیکن ایک قدیم روش کو ایک دم چھوڑ دینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس لیے کبھی تو وہ اس قدیم روش کے تقاضے پورے کرنے میں لگ جاتی ہے اور اس کے تحت نیشنلزم اور سیکولرزم وغیرہ کا دم اس شد و مد سے بھرنے لگتی ہے کہ کسی مسلم اجتماع میں اسے شرکت سے محض اس بنا پر گریز ہونے لگتا ہے کہ اس سے اس کی نیشنلزم پر کوئی داغ نہ لگ جائے اور اگر "غلطی" سے وہ مسلمانوں کے کسی ایسے مشترک ادارے میں جو مشترک ملی اور مسائل پر غور و مشورہ کے لئے قائم کیا گیا ہو، شریک بھی ہو جاتی ہے تو فوراً اسے اپنی "غلطی" کا احساس ہو جاتا ہے اور جھٹ دامن جھاڑ کر اس سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور اگر وہ خود مسلمانوں ہی کے عام مسائل پر غور کرنے کے لئے کوئی اجتماع بلاتی ہے تو اس کا پورا اہتمام کرتی ہے کہ وہ صرف نیشنلسٹ اور سیکولر ذہن کے مسلمانوں کا اجتماع ہو اور جن کو وہ فرقہ پرست، یا سیکولرزم کا مخالف سمجھ رہی ہو، ان کو اس سے دور ہی رکھا جائے۔

اور کبھی ان باتوں کا خیال چھوڑ کر مسلمانوں کے پیش آمدہ حالات و مسائل کو پوری اہمیت دینے لگتی ہے اور ان کو حل کرنے کے وہ طریقے بھی اختیار کرتی ہے جو اس کے لئے مفید معلوم ہوں خواہ وہ قدیم روش یا نیشنلزم اور سیکولرزم وغیرہ کے اصل طریقوں سے کچھ میل بھی نہ کھاتے ہوں۔ اور در اصل انہی دونوں باتوں کو ملانے ہی سے وہ معمہ پیدا ہوتا ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔

دلائل کا جائزہ اس ضمنی گفتگو سے جو افسوس ہے کہ اختصار کی کوشش کے باوجود طویل ہو گئی ہے۔

فارغ ہو کر اب ہم مذکورہ سوال کے جواب کا کچھ مختصر جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ "اگر ہم مسلمانوں کے ووٹ فرقہ وارانہ بنیادوں پر حاصل کرنے کی کوشش کریں، تو یہ ہر اعتبار سے غلط ہے۔ کیونکہ اگر اکثریت کی فرقہ واریت غلط ہے تو آپ کو بھی فرقہ واریت کا حق نہیں"۔

اس عبارت میں مسلمانوں کے ووٹ فرقہ وارانہ بنیاد پر حاصل کرنے کی کوشش کو ہر اعتبار سے غلط قرار دیا گیا ہے لیکن دلیل صرف فرقہ واریت کی بنیاد پر اس کے غلط ہونے کی دی گئی ہے، اس لئے ہم بھی اپنی گفتگو صرف اس دلیل تک محدود رکھیں گے۔

جہاں تک ہمارے علم و واقفیت کا تعلق ہے مسلمانوں کی کسی سیاسی جماعت کی تشکیل کی طرح فرقہ وارانہ بنیاد پر ان کے ووٹ حاصل کرنے کی بھی کوئی تحریک شمالی ہند میں اب تک نہیں اٹھی ہے اور نہ مخلوط انتخاب کی موجودگی میں بظاہر اس کے اٹھنے کا کوئی امکان ہے۔ ویسے الیکشن آنے پر ہو سکتا ہے کہ خاص خاص حلقوں میں جہاں کچھ مسلمان امیدوار ہوں اس طرح کی کوششیں مقامی طور سے جا بجا ظہور میں آئیں لیکن یہ ہندوستان کے لئے کوئی نئی یا اجنبی بات نہ ہوگی۔ فرقہ واریت کی مذمت میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی بات دوسری ہے لیکن جب الیکشن کا وقت آتا ہے تو اس حمام میں سب ہی ننگے نظر آتے ہیں۔ خود کانگریس کا دامن بھی خاص خاص فرقوں کے ناموں پر ووٹ حاصل کرنے کے داغ دھبوں سے پاک نہیں ہے اور اس کے لئے تو وہ خاص طور سے بدنام ہے کہ اپنے مسلمان امیدواروں کو وہ زیادہ تر مسلم اکثریت کے حلقوں ہی سے کھڑا کرنے کی کوشش کرتی ہے اور انھیں کامیاب بنانے کے لئے خاص طور سے علمار کرام کی خدمات حاصل کرتی ہے اور وہ شوق سے پیش بھی کرتے ہیں ورانحالیکہ ان میں کتنے اپنے طور سے اس طرح کی کسی کوشش کو غلط اور عین فرقہ پرستی بھی سمجھتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے عبارت بالا کو پڑھ کر شاید ہی کسی کا ذہن جماعت اسلامی کی طرف

منتقل ہو سکتا ہے اور خود موصوف کو بھی غالباً اس میں تکلف ہی ہوگا کہ اپنی اس بات کے سلسلہ میں جماعت اسلامی کا نام لیں۔ کیونکہ الیکشن کے ہر پہلو کے بارے میں اس کا موقف اتنا واضح اور معروف اور اس بیان کردہ طریق سے اتنا دور ہے کہ اس کی طرف سے اس طرح کی کوئی بات منسوب کرنے کے لئے بہت غیر معمولی جسارت کی ضرورت ہوگی۔ البتہ اس بات کا امکان ہے کہ کچھ لوگ اس موقع پر مسلم مجلس مشاورت کا نام لیں، اور ہو سکتا ہے کہ موصوف کا روئے سخن بھی خاص طور سے مجلس مشاورت کی طرف رہا ہو۔ لیکن جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے، ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے اوپر بھی اس طرح کی کسی کوشش کا الزام ایک اتہام ہی ہوگا۔

مسلم مجلس مشاورت کا ایک بڑا مقصد فرقہ پرستی کو ختم کرنا ہے نہ کہ اس کو اور ترقی دینا، اور اس مقصد کو وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک دوسرے سے قریب لاکر حاصل کرنا چاہتی ہے اس لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے ان کے درمیان بُعد اور بڑھے، خود اس کے مقصد کے منافی ہے۔ بلاشبہ اس کے سامنے مسلمانوں کے مسائل بھی ہیں لیکن ان کے حل کے سلسلہ میں بھی وہ کوئی فرقہ وارانہ طریق کار اختیار کرنا نہیں چاہتی جس کا اندازہ خود اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر ایک فرقہ ہونے کے بجائے خیر امت ہونے کا احساس پیدا کرنا چاہتی ہے جس کے دائرۂ کار میں فطری طور سے اتنی وسعت ہے کہ پورے ملک اور یہاں کے جملہ فرقوں کی خیر خواہی، خدمت اور اصلاح اس میں شامل ہو سکتی ہے۔ اس نے جو منشور ابھی حال میں شائع کیا ہے اس میں تین راہ نما اصول بھی بیان کئے گئے ہیں، جو درحقیقت اس کے پورے طریقۂ کار کے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر بھی اس کے وسیع اور غیر فرقہ وارانہ طرزِ فکر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور جن نو نکات کے لئے وہ اس وقت پورے ملک کی رائے عامہ ہموار کرنا چاہتی ہے، ان کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے انھیں فرقہ وارانہ قرار دینا بھی کسی انصاف پسند کے لئے

مشکل ہے ۔ان میں مسلمانوں کے مفاد کے ساتھ پورے ملک کے مفاد کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اسی بنا پر مسلمانوں کے ساتھ ان کے لیے غیر مسلموں کی تائید حاصل کرنے کا بھی اس نے فیصلہ کیا ہے اور یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ اس نے تا حال جو کچھ طے کیا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ ان نکات کے حق میں رائے عامہ ہموار کی جائے اور آگے وہ جو کچھ طے کر سکتی ہے وہ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر ہی ہوگا نہ کہ ان کو بالائے طاق رکھ کر۔اس لئے آئندہ کے بارے میں بھی خواہ مخواہ فرقہ پرستی کے پہلو سے کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال عبارت بالا کے ضمن میں مسلم مجلس مشاورت کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اس موقع پر مسلم لیگ کا جو صرف جنوب کی ایک دو ریاستوں میں اپنا حلقہ اثر رکھتی ہے۔ نام ضرور لیا جا سکتا ہے جو زیادہ تر مسلمانوں ہی کے ووٹوں سے کامیاب ہوتی ہے اور غالباً مسلمانوں سے مسلمان ہونے ہی کی بنیاد پر ووٹ بھی طلب کرتی ہے لیکن مسلم لیگ کے مقصد اور طریقہ کار بلکہ خود اس کے وجود تک سے بھی اختلاف رکھنا ایک الگ بات ہے اور اس طرح کی اس کی کسی کوشش کو فرقہ واریت قرار دینا الگ۔ ہم خود اپنے اصول و نظریات کے مطابق جیسا کہ گذر چکا ہے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تنظیم کو پسند نہیں کرتے اور ان کا مطمح نظر اس سے اونچا دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جائز حقوق کے لئے ان کی جد وجہد کو فرقہ واریت قرار دے کر غلط ٹھہرانا بھی ہمیں ایک زیادتی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ خود دستور ہند کی رو سے یہ ان کا ایک جائز حق ہے۔اس لئے جب تک کہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ مسلم لیگ کا اس طرح ووٹ حاصل کرنا واقعی فرقہ واریت ہے اس وقت تک اسے غلط قرار دینا بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور ہمارا خیال یہ ہے کہ خود اس انٹرویو میں فرقہ واریت کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی رو سے بھی اس کو فرقہ واریت ثابت کرنا مشکل ہے۔

فرقہ واریت کا مفہوم

نامہ نگار کا ایک سوال یہ بھی تھا کہ "آپ کے نزدیک فرقہ واریت کا مفہوم کیا ہے۔ جب آپ کسی جماعت کو فرقہ وارانہ کہتے ہیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

اور اس نے یہ سوال کرتے وقت اس پر اتنا اور اضافہ بھی کیا تھا کہ "فرقہ واریت کی جامع و مانع تعریف اب تک کسی بھی ڈکشنری میں نہیں کی جاسکی ہے"۔

اس سوال کا جواب موصوف نے اس طرح دیا کہ پہلے تو سوال کے آخری جملہ میں اپنا یہ جوڑ لگایا کہ "اور نہ اس کی تعریف کرکے کسی الجھن میں پھنسنا چاہیئے"۔ مگر سوال کا جواب دینا بھی ان کے لیے ضروری تھا کیونکہ اس میں اس کا حوالہ بھی تھا کہ موصوف کچھ جماعتوں کو فرقہ وارانہ کہتے رہتے ہیں اس لئے اس موقع پر خاموشی کے معنی یہ ہوتے کہ وہ اس لفظ کا کوئی متعین مفہوم ذہن میں رکھے بغیر ہی یہ تیر چلاتے رہتے ہیں اس لئے اس مشکل لفظ کی تعبیر کی الجھن میں انھیں اپنے آپ کو ڈالنا ہی پڑا اور اس کی تعریف یہ فرمائی:

> "فرقہ واریت کا میرے ذہن میں جو مفہوم ہے وہ یہ ہے کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے خلاف منافرت اور دشمنی پیدا کرائے، میں اسی کو فرقہ واریت سے تعبیر کرتا ہوں"۔

اور اسی سوال کے ایک ذیلی سوال کا جواب دیتے ہوئے اس تعریف کو انھوں نے بے تکلف جماعت اسلامی اور مسلم لیگ پر چسپاں بھی فرما دیا!

سردست اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ فرقہ واریت کی یہ تعریف صحیح ہے یا غلط لیکن اس تعریف سے اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ موصوف کے نزدیک بھی یہ فرقہ واریت نہ ہوگی کہ ایک فرقہ اپنے جائز حقوق کے لیے جائز طریقہ سے جدوجہد کرے۔ اور خود اس جماعت کے عمل بلکہ طے شدہ مقاصد سے بھی اس کی بہرحال تصدیق ہی ہوتی ہے۔ البتہ وہ فرقہ اس کے ساتھ دوسرے فرقوں کے خلاف منافرت

اور دشمنی پیدا کرے تو اس پر اس کا اطلاق صحیح ہوگا۔

فرقہ واریت اور مسلم لیگ

اب غور طلب بات یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرتے وقت اس دوسرے فعل کی بھی مرتکب ہوتی ہے؟ واضح رہے کہ بات تقسیم کے بعد کی مسلم لیگ کے بارے میں ہو رہی ہے جس سے خود کانگریس ایک بار کیرلہ میں انتخابی سمجھوتہ کرکے اس کے دوش بدوش انتخاب لڑ چکی ہے اور اس سمجھوتہ کی ایک فریق پرجا سوشلسٹ پارٹی بھی تھی اور اِس الیکشن میں بھی کم از کم کیرلہ کانگریس تو اس کے ساتھ دوبارہ سمجھوتہ کرنے پر آمادہ تھی یہ تو غالباً خود مسلم لیگ کی اپنی مصلحتیں تھیں کہ اس پر اس نے بائیں بازو کے کیمونسٹوں کو ترجیح دی۔

جب واقعات یہ ہوں تو یہ سوچنا ہی پڑے گا کہ مسلم لیگ کا انتخابات میں طریقۂ کار کیا ہے۔ اگر وہ غیر مسلموں کے خلاف منافرت اور دشمنی پیدا کرکے ہی مسلمانوں کے ووٹ حاصل کیا کرتی ہے تو کیا یہ پارٹیاں اندھی ہیں کہ موصوف تو دور بیٹھ کر دیکھ لیں کہ مسلم لیگ غیر مسلموں کے خلاف منافرت اور دشمنی پیدا کرنے کا یہ کھیل کھیلتی ہے لیکن وہ قریب رہ کر بھی اس کا کچھ اندازہ نہ کر سکیں یا موصوف کے نزدیک ان پارٹیوں پر بھی مسلم لیگ کا سایہ کچھ اس طرح پڑ گیا ہے کہ وہ خود بھی خاص ان معنوں میں فرقہ پرست ہو گئی ہیں کہ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر غیر مسلموں کے خلاف اس کی منافرت اور دشمنی کی مہم میں اسے کمک پہنچائیں یا صاف لفظوں میں یہ کہ وہ غیر مسلموں کی دشمن بن چکی ہیں!

معاہداتی سیاست

دوسری خاص بات جو مسئلۂ زیر بحث سے متعلق ہے وہ ہے جس میں سیاسی پارٹیوں سے معاہدہ کرنے کے مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ موصوف نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی تنظیم بنا کر سیاسی پارٹیوں سے معاہدہ کرنا ان کے لئے مفید نہیں ہے۔ اگر بات یہ کہی گئی ہوتی کہ چونکہ مسلمان منظم نہیں ہیں اس لئے

معاہدہ کی بات کچھ زیادہ چل نہیں سکے گی۔ تو یہ یک گونہ قابلِ غور بات ہو سکتی تھی۔ کیونکہ تنظیم کے پہلو سے مسلمانوں کا جو حال ہے واضح ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ ایک مسلمہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ کسی معاہدہ کے لئے دونوں فریق میں سے ہر ایک کا مساوی درجہ میں نہ سہی کسی نہ کسی درجہ میں طاقتور ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک فریق بالکل کمزور ہے تو معاہدہ کے بجائے کوئی رعایت نامہ ہی وجود میں آسکتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب دوسرا فریق اس پر مطمئن بھی ہو کہ اس سے اس کے نفع و نقصان کے میزانیہ میں نفع کا پہلو غالب ہوگا۔ سیاسی پارٹیوں کا مزاج ہی کچھ ایسا بن چکا ہے کہ کوئی معقول سے معقول بات بھی ان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اُسے نفع و نقصان کی ترازو پر تول کر اپنے فائدہ کی طرف سے پورا اطمینان حاصل نہ کرلیں۔ لیکن موصوف نے اس مسئلہ پر اس حیثیت سے کوئی گفتگو نہیں فرمائی ہے بلکہ اس کی بجائے انھوں نے مسلمانوں کی نفسِ تنظیم ہی کو ایک غلط کام ٹھہرایا ہے جس کی دلیل غالباً وہی ہوگی جس پر ہم اس سے پہلے کی بحث میں گفتگو کر چکے ہیں یعنی اس کا فرقہ واریت ہونا۔ اس لئے اسے چھوڑ کر ہم یہاں چند جملے ان دلیلوں کے بارے میں عرض کرنا چاہتے ہیں۔ جن کی بنا پر انھوں نے سیاسی پارٹیوں سے معاہدہ کرنے کو مسلمانوں کے لئے غیر مفید بتایا ہے۔

> ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اس وقت تو سب جماعتیں ہر چیز کو مان لیں گی لیکن پھر عمل نہ ہوگا۔

موصوف نے تنظیم کی جس شکل کو سامنے رکھ کر یہ گفتگو فرمائی ہے وہ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کم از کم فی الحال ایک خیالی سی بات ہے اس لئے اس کے خلاف یہ دلیل بازی کچھ بے محل سی بات معلوم ہوتی ہے اور اس بنا پر اس پر گفتگو بھی بے محل ہی ہوگی۔

پھر بھی ہم یہاں اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ موصوف نے جس خطرہ کی طرف اشارہ

کیا ہے، مسلمانوں کے غیر منظم ہونے کی حالت میں تو اس کا امکان واقعی زیادہ ہے لیکن ان کی تنظیم کے ساتھ یہ خطرہ کم سے کم ہو سکتا ہے کیونکہ اس وقت ہر پارٹی جس سے معاہدہ ہوگا خود اپنے نفع و نقصان کی خاطر ان کا پاس و لحاظ کرنے پر مجبور ہوگی اور کوئی معاہدہ ظاہر ہے اس طرح تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں یہ بات ملحوظ ہی نہ رکھی گئی ہو کہ فریق معاہدہ کون اور کیسا ہے اور عملاً اس کا پابند رہ سکے گا یا نہیں۔

معاہدہ کو مسلمانوں کے لئے غیر مفید ثابت کرنے کے لئے دوسری دلیل انھوں نے اس طرح پیش فرمائی ہے کہ ان کی جماعت اس وقت تو ہر پارٹی سے مسلمانوں کے کام لے لیتی ہے لیکن کسی پارٹی سے معاہدہ کر لینے کے بعد دوسری پارٹیاں مسلمانوں اور ان کی جماعت کی مخالف ہو جائیں گی، اور مسائل سمجھنے کے بجائے اور الجھ جائیں گے۔

اس دلیل کو پڑھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر یہ نہ پیش کی جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ اول تو ملکی پارٹیوں کی حیثیت سے اس جماعت کی غیر جانبداری کا دعویٰ ہی ایک خلاف واقعہ بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ عملاً اس کے بڑے بڑے لیڈر ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا کرتے ہیں اور اس جماعت نے جیسا کہ گذر چکا ہے باقاعدہ یہ طے کر رکھا ہے کہ فرقہ پرست پارٹیوں سے وہ ہر حال میں علیحدہ رہے گی اور وہ عام مسلمانوں کو جو پیغام دے رہی ہے اس میں یہ بھی موجود ہے کہ وہ فرقہ پرست پارٹیوں کو ووٹ نہ دیں اور نہ ان میں شریک ہوں۔ ایسی حالت میں اس کے رویہ کو پارٹیوں کے مقابلہ میں غیر جانبدارانہ کیسے کہا جا سکتا ہے، اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو غیر جانب دار رہنے کا جو یہ فائدہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے دوسری پارٹیاں مسلمانوں اور اس جماعت کے خلاف نہیں ہو سکیں گی، کم از کم ان فرقہ دار پارٹیوں کی حد تک تو اس کی کوئی توقع کی ہی نہیں جا سکتی بلکہ معاملہ اور الٹا ہو جاتا ہے کہ اس سے ان کی مخالفت اور بڑھتی ہے۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ مسلمانوں کے لئے بڑا مسئلہ ایسی ہی پارٹیوں سے پیدا ہوتا ہے۔

دوسرے غیر جانب داری کا جو فائدہ بیان کیا گیا ہے، اس کا پورا طول و عرض ناپنے کے بعد بھی بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؏

دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یہ جماعت اس غیر جانبداری سے اپنا کیا کام ان پارٹیوں سے نکالا کرتی ہے، اس کا صحیح حال تو اس جماعت کے لوگوں ہی کو معلوم ہوگا لیکن اس سے دوسرے مسلمانوں کے کام جس طرح نکل رہے ہیں اس کی حقیقت اس سے واضح ہو سکتی ہے کہ وہ ہر روز کچھ پہلے سے زیادہ پریشان ہوتے جا رہے ہیں اور جو مسئلے ان کے لئے موت و زندگی کے مسئلے بنے ہوئے ہیں وہ کچھ سلجھے نہیں بلکہ اور کچھ الجھ ہی گئے ہیں۔ اور یوں کہنے کی تو بات دوسری ہے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اس "غیر جانبداری" کے ثمرات و برکات پر یہ لوگ بھی کچھ ایسے مطمئن نہیں ہوں گے اور اس کے ثبوت میں خود ان کی بہت سی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں تو کیا ایسی حالت میں بھی اس غیر جانب داری کو سینہ سے لگائے رکھنا ضروری ہے اور یہ بات قابلِ غور بھی نہیں ہے کہ اپنی حالت اور موقف میں کچھ ایسی تبدیلی کی جائے کہ پارٹیاں واقعی مسلمانوں کا کچھ وزن محسوس کریں اور رعایت و مروت میں نہیں بلکہ ان کے حق کے طور پر ان کے جائز حقوق انھیں دینے پر آمادہ ہوں، اس مقصد کے لئے یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ آپ خواہ مخواہ کسی پارٹی سے ووٹ دینے اور دلوانے کے سلسلہ میں کوئی معاہدہ ہی کریں، لیکن اگر اس سے کوئی فائدہ پہونچنے کی توقع کی جا سکتی ہو تو محض دوسری پارٹیوں کی مخالفت کے اندیشے سے اس سے رکا رہنا جرأت و دانشمندی دونوں کے خلاف ہوگا۔ معاہدہ کے معنی ہی یہ ہوں گے کہ آپ مخالف پارٹیوں کے مقابلہ کے لئے تنہا نہ ہوں گے۔ اور کوئی اس کے لئے آپ کو مجبور بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے ذریعہ خواہ مخواہ آپ ایسی مخالفتیں مول لیں جن کا مقابلہ آپ مل کر بھی نہ کر سکتے ہوں اور ان سب کو ہر حال میں مخالف فرض کر لینا بھی کیا ضرور ہے، کیا آپ کچھ ایسی باتیں منوانا چاہیں گے جن کو ایک پارٹی تو قبول کر لینے میں کوئی حرج

اپنے یا ملک کے لئے نہ سمجھے اور دوسری تمام پارٹیاں ان کی بنا پر آپ کو گردن زدنی شمار کریں؟

اور تیسری آخری بات یہ ہے کہ غیر جانبداری کے ثمرات و برکات ہم اس سے زیادہ فرض کر لینے کے لئے تیار ہیں جتنے بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن اگر وہ اس قیمت پر حاصل ہو رہے ہوں کہ مسلمانوں کا موجودہ انتشار اگر بڑھے نہیں تو قائم ضرور رہے تو کیا پھر بھی اسے فائدہ ہی کا سودا سمجھا جا سکتا ہے؟

جو فلسفہ اس وقت زیر بحث ہے اس کا صریح تقاضا یہ ہے کہ مسلمان الیکشن میں اور اس کے علاوہ اور حالات میں بھی دوسری پارٹیوں کا ساتھ دینے اور ان میں شریک ہونے میں اس حد بندی کو بھی قائم نہ رکھیں جو ان کی جماعت نے فرقہ پرستی کی بنیاد پر قائم کر رکھی ہے اور جب اس جماعت نے اپنے اسی فلسفہ کے زیر اثر پہلے ہی سے مسلمانوں کو یہ اذنِ عام دے دیا ہے کہ وہ کسی پارٹی کے بنیادی نظریات کو اس حیثیت سے زیر بحث لائے بغیر کہ اسلام سے ان کی نسبت کیا ہے، ان میں بے تکلف شریک ہو سکتے ہیں اور اس نقطہ نظر کو اس طرح تقویت بھی پہونچائی جا رہی ہے کہ ان میں سے ایک جماعت کا جس کا اسلام کیا، نفسِ مذہب کے بارے میں معاندانہ نقطۂ نظر ایک معلوم سی بات ہے، غیر جانبداری کے فوائد بیان کرتے ہوئے اس حیثیت سے تعارف کرایا جا رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے مفادات اور مسائل کو حل کرانے میں پورا حصہ لیتی ہے۔ تو اس کا ملّی وحدت اور اس کی شیرازہ بندی پر جو کچھ اثر پڑ سکتا ہے اس کا قیاس کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ اسلام کے ماننے کے تقاضے کیا کیا ہیں اور وہ ملک کی تعمیر و اصلاح کے سلسلہ میں خود اپنا کوئی پیغام رکھتا ہے یا نہیں تو اس موقف کی رو سے اس کا سوال ہی بے معنی ٹھہرتا ہے۔

مسلمانوں میں بیداری

کی

نئی کروٹ

مسلمانوں کے مخصوص مسائل

یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے کچھ مسائل ہیں جو اپنا فوری حل چاہتے ہیں۔ جن لوگوں کا تصور یہ ہے کہ سیکولر جمہوریت میں ہندو مسلم کا کوئی سوال نہیں

اٹھنا چاہیئے۔ وہ لوگ بھی اس سے چشم پوشی نہیں کرسکتے ہیں کہ مسلمانوں کے کچھ حل طلب مسائل ہیں، اور ملک کی ایک بڑی اقلیت ہونے کی بنا پر وہ مستحقِ توجہ ہیں۔

جان و مال کی حفاظت کا مسئلہ

یہ مسائل اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں ان میں کچھ مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق ہندوستان میں ان کے تحفظ و بقاء کے مسئلہ سے ہے۔ مثلاً اس احساس میں ان کا ہر چھوٹا بڑا ان پڑھ اور تعلیم یافتہ، امیر و غریب، شہری یا دیہات کا رہنے والا، شریک ہے کہ اس کی جان و مال ہر وقت خطرہ میں ہے۔ ہندوستان کی تقسیم پر مدت گذر چکی ہے اور اس سے قدرتاً جو زخم دلوں پر لگے تھے وہ بڑی حد تک مندمل ہو چکے ہیں۔ اور جو مسلمان ہندوستان میں رہ رہے ہیں، انھوں نے یہاں رہنے بسنے اور ملک کے شہری ہونے کے جو تقاضے ہو سکتے ہیں ان کو پورا کرنے کا نہ صرف تہیہ کر لیا ہے بلکہ اس مدت میں اس کا بہتر سے بہتر ثبوت بھی پیش کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ معمولی معمولی باتوں پر اور اکثر حالات میں، ان کے کسی ادنیٰ قصور کے بغیر ان کی بستیوں اور محلوں پر فساد انگیز عناصر دھاوا بول دیا کرتے ہیں اور چشم زدن میں ان کا مال و متاع لوٹ لیا جاتا ہے، ان کے مکانات اور دکانیں مٹی کا ڈھیر بنا دی جاتی ہیں، اور ان کے بوڑھوں اور بچوں پر بھی ترس نہیں کھایا جاتا ہے اور پھر اس کے بعد وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں پر امن و امان کے قیام اور ان کے جان و مال اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ ان کی داد و فریاد پر کان دھرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے یا پھر الٹا انہی کو مجرم گردانتے ہوئے انھیں جیلوں میں بند کرنا اور مقدمات میں ماخوذ کرنا شروع کر دیا جاتا ہے اور مزید برآں جو کچھ ہوتا ہے اسے پاکستان کے واقعات کا ردِ عمل قرار دے کر ان کے زخموں پر نمک پاشی بھی کی جاتی ہے تو اس سے قدرتی طور پر ان کے دلوں میں اضطراب و ہیجان پیدا

ہوتا ہے۔ اور وہ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ آخر ہندوستان میں رہتے ہوئے وہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے کن تدبیروں پر بھروسہ کریں۔

معاشی مسئلہ تحفظ و بقا کے مسئلہ سے ان کی معاشی حالت کا بھی بہت گہرا تعلق ہے، ایک طرف تو انھیں فسادات کے نتیجہ میں شدید ترین معاشی زوال کا شکار ہونا پڑتا ہے، کیونکہ یہ فسادات خاص طور سے ان مقامات پر زیادہ پیش آتے ہیں جہاں کے مسلمان معاشی حیثیت سے کچھ اچھی حالت میں ہوتے ہیں یا جہاں صنعت و تجارت میں وہ کوئی خاص مقام رکھتے ہیں اور دوسری طرف زمین داری کے خاتمہ کے بعد ان کے ایک بڑے طبقہ کا سب سے بڑا سہارا صرف ملازمت ہی ہو سکتی تھی لیکن اس کی راہیں بھی ان کے لئے نہایت تنگ ثابت ہو رہی ہیں۔ سرکاری ملازمتوں کے لئے منتخب ہونے والے امیدواروں کی جو فہرستیں آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ان میں جگہ پانے کی کہاں تک گنجائش ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں تھوڑا بہت دخل مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی یا ان کی اس مایوسانہ ذہنیت کا بھی ہو کہ ملازمتوں میں ان کے ساتھ ضرور ہی امتیاز برتا جائے گا لیکن کون یہ باور کر سکتا ہے کہ ملک کے تقسیم ہوتے ہی یا اس کے بعد کی اس قلیل مدت میں وہ بالکل ہی نکمے اور نااہل بن چکے ہیں یا وہ سب کے سب اپنی شدید ترین احتیاج کے باوجود ملازمتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے پر آمادہ نہیں ہیں اور اگر بالفرض ان باتوں میں کوئی وزن ہے تو کیا حکومت یا اکثریت پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ ان کی تعلیمی پسماندگی یا ان کی مایوسانہ ذہنیت کو دور کرنے کے لئے کچھ مفید اور موثر تدابیر عمل میں لائی جائیں، لیکن دیکھا یہ جا رہا ہے کہ ایسی تدابیر تو خیر کیا عمل میں لائی جاتیں اس کی بجائے کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ ان کے جو اپنے تعلیمی ادارے تھے اور جن سے کسی درجہ میں ان کی تعلیمی پس ماندگی کا کچھ مداوا ہو رہا تھا ان کو بھی "قومیایا" جا رہا ہے اور وہ بھی ایسے انداز اور اعلان

کے ساتھ کہ ان کی مایوسانہ ذہنیت دور ہونے کے بجائے کچھ اور زیادہ مستحکم ہوجائے۔

عزت و آبرو معاشی مسئلہ سے کہیں زیادہ اہم عزت و آبرو کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ ہر شخص عزت چاہتا ہے اور بے عزتی کو کوئی بھی گوارا نہیں کرسکتا۔

اور اس پہلو سے حالت یہ ہے کہ جو لوگ دن رات حکومت یا اکثریت کی ہر جائز و ناجائز خواہش کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں وہ خود بھی اس سے مطمئن نہیں ہیں کہ اس کے باوجود وہ مشتبہ یا غیر وفادار نہ سمجھے جا رہے ہوں، کسی دن ان کو علانیہ اس کا سرٹیفکیٹ نہیں مل جائے گا، اور عام مسلمانوں کا اس پہلو سے جو حال ہے اس کے اندازہ کے لئے اس طرف اشارہ کردینا کافی ہوگا کہ ابھی گذشتہ جنگ کے موقع پر کسی کے چہرے پر محض ڈاڑھی کا ہونا ہی اس بات کی علامت سمجھا گیا کہ وہ پاکستانی یا اس کا جاسوس ہے اور اس بنا پر اس کے ساتھ توہین و تذلیل کا وہ رویہ اختیار کیا گیا جس پر خود ایک غیر مسلم انگریزی روزنامہ بھی اکثریت کو شرم دلانے سے باز نہیں رہ سکا۔ اور اس پر طرہ حکومت کا یہ طرزِ عمل ہے کہ اس نے کسی ادنیٰ ثبوت کے بغیر ان کے ہزاروں معززین تک کو محض شبہ کی بنا پر ڈی آئی آر کا نشانہ بنا کر جیلوں میں بند کردیا تھا۔ کیا یہ صورتِ حال مسلمانوں کی غیرت و حمیت اور عزتِ نفس کے لئے ایک کھلا ہوا چیلنج نہیں ہے؟

تعلیم اور پرسنل لا پھر جو لوگ مسلمانوں کے مزاج اور ذہنی ساخت سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہوسکتے کہ مسلمان خواہ اپنی عملی زندگی میں دینی لحاظ سے کتنی ہی پستی میں کیوں نہ جاچکے ہوں لیکن اب بھی ان میں اپنے مذہب کے لئے اتنا شغف اور لگاؤ باقی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ قربان کردینے کے لئے آمادہ ہوسکتے ہیں لیکن اپنے مذہب پر آنچ آنے دینا حتی الوسع گوارا نہیں کرسکتے۔ مگر حالت یہ ہے کہ قدم قدم پر ان کی اسی رگ کو ٹھیس لگائی جارہی ہے ان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں مذہبی حیثیت سے جو جو کے مختلف شکلوں میں دن رات

سہنے پڑتے ہیں، ان کا تو خیر ذکر ہی کیا، نظام تعلیم اور درسیات کے ذریعہ گویا ایک منظم تحریک
چلائی جارہی ہے کہ ان کا رشتہ اپنے دین اور ملی خصوصیات و روایات سے باقی نہ رہ
سکے تاکہ انھیں جس نئے سانچے میں ڈھالنا مقصود ہے اس کے لئے راستہ پوری طرح
ہموار ہو جائے۔ اور حد یہ ۔ کہ ان کا پرسنل لا جوان کے اپنے عقیدہ کے مطابق ان
کے دین کا ایک جزءِ لاینفک ہے ۔ اور جس میں ان کو کوئی مداخلت گوارا نہیں ہوسکتی
اور جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے غیر ملکی حکومت بھی اس میں مداخلت و تصرف سے
ہمیشہ کنارہ کش رہی ہے اسے بھی تختۂ مشق بنانے کا ارادہ کرلیا گیا ہے۔ حکومت کی طرف
سے جب جب یہ سوال اٹھایا گیا، تقریباً تمام مسلمانوں نے یک زبان ہو کر اس کی
مخالفت کی لیکن اس کے باوجود بار بار یہ مسئلہ زیر بحث آتا رہتا ہے اور حکومت کے
ایک حالیہ بیان سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اب اس سلسلہ میں کچھ عملی قدم اٹھانے کا
بھی تہیہ کرلیا گیا ہے۔ ملک اس وقت جن نازک ترین حالات و مسائل سے دوچار
ہے ان کا حال سب کو معلوم ہے لیکن ان کی فکر چھوڑ کر حکومت یا ممبرانِ پارلیمنٹ کا
اس مسئلہ سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کرنا صاف یہ معنی رکھتا ہے کہ مسلمانوں کو
اپنے دین کے اس جز کی طرف سے بھی، جس کو ان کی نگاہ میں ایک بنیادی اہمیت
حاصل ہے، مطمئن نہیں رہنے دیا جائے گا اور اس کے لئے دلیلیں بڑی عجیب اور
دلچسپ پیش کی جارہی ہیں۔ مثلاً یہ کہ متعدد مسلم ممالک میں بھی پرسنل لا میں تبدیلیاں
کی جاچکی ہیں، حالانکہ اسلام سے معمولی واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص یہ بآسانی سمجھ
سکتا ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کے لئے کسی مسلم حکومت کا طرزِ عمل بھی سند نہیں
بن سکتا۔ اور یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اگر حکومت کے ذمہ دار اس معاملہ
میں ان کی تقلید ضروری ہی سمجھتے ہیں۔ تو آخر اس معاملہ میں ان کی تقلید کیوں نہیں کرتے کہ
انھوں نے اگر مسلم پرسنل لا میں کچھ تبدیلیاں کی بھی ہیں تو انھوں نے اپنے ملک کے

غیر مسلم شہریوں کو اس کے اطلاق سے بہر حال مستثنیٰ رکھا ہے اور ان کے پرسنل لا میں کسی مداخلت کے روادار نہیں ہوئے ہیں۔

اوپر جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ یہ سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ ہندوستان میں یقیناً مسلمانوں کے کچھ حل طلب مسائل ہیں اور ان کے سلسلہ میں اگر اس وقت وہ مضطرب اور پریشان ہیں تو یہ کوئی بے وجہ بات نہیں ہے اور اس بنا پر یہ بات بھی کچھ عجیب نہیں سمجھی جاسکتی اور نہ اس پر انھیں مستحقِ ملامت قرار دیا جاسکتا کہ وہ پریشان ہو ہو کر اپنے اب تک کے اپنائے ہوئے طریقوں سے ہٹ کر ان کے حل کے لئے کچھ نئے طریقے تلاش کرنے لگے ہیں، اور انھیں اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمان اس ملک کے باقاعدہ شہری ہیں اور یہاں کے دستور نے شہری ہونے کی حیثیت سے جہاں ان پر کچھ ذمہ داریاں ڈالی ہیں، وہیں ان کے کچھ حقوق بھی تسلیم کئے ہیں، اور ان حقوق میں یہ حق بھی شامل ہے کہ یہاں جتنے بھی فرقے اور مذہبی گروہ پائے جاتے ہیں، اپنے مخصوص جداگانہ تشخص اور خصوصیات کو نہ صرف برقرار رکھ سکتے ہیں بلکہ ان کو پروان بھی چڑھا سکتے ہیں اور درحقیقت یہ حق تسلیم کرکے دستور نے صرف یہاں کی اقلیتوں کے ساتھ انصاف ہی نہیں کیا ہے بلکہ ملک کی بھی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ ہندوستان متعدد مذاہب کا گہوارہ ہے جو اپنی خاص روایات و خصوصیات رکھتے ہیں اور یہ روایات و خصوصیات ان مذاہب کے ماننے والوں کو حد درجہ عزیز ہیں۔ اس لئے یہ بات ملک کی وحدت و سلامتی کے لئے ایک خطرہ ثابت ہوتی کہ ان سب کی الگ الگ حیثیتوں کو مٹا کر کے یہاں ایک ہم رنگ مذہب و کلچر رائج کرنے کی کوشش کی جاتی۔ حقیقت پسندی اور ملک کی بہی خواہی کا بہر حال تقاضا یہی تھا کہ یہاں کثرت میں اس طرح وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ سب اپنی اپنی جگہ قائم و برقرار رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا رویہ اختیار کریں اور اپنے اپنے الگ مفادات کے ساتھ ملک کے عمومی مفاد کو بھی پیش نظر رکھیں۔ چنانچہ جہاں تک ہم نے سمجھا ہے، یہاں کا دستور یہی چاہتا ہے اور سیکولرزم کی ذمہ دارانہ تعبیر کے مطابق اس کی بھی حقیقت بس

یہی قرار پاتی ہے۔ اس کے ماسوا اس سے جو معنی نکالے جا رہے ہیں یا فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کی تعبیر جو اس طرح کی جارہی ہے کہ اپنے جائز حقوق کے تحفظ اور اپنے جداگانہ تشخص کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے جو کوششیں کی جائیں وہ بھی ان کے مفہوم میں شامل ہوجائیں وہ درحقیقت ایک سازش ہے جو خود دستور کو بالائے طاق رکھ کر ان لوگوں کی طرف سے شروع کی گئی ہے جو نفسِ مذہب کو، جو مذہبی فرقوں کے وجود میں آنے کی اصل اساس ہے، بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ مذہب کے کچھ نام لیوا بھی اپنی سادہ لوحی سے اس سازش کا شکار ہوکر خود ان سے بھی بڑھ چڑھ کر اس کو کامیاب بنانے میں اپنی ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں! مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس سازش کا جادو سب پر کامیاب ہو سکتا ہے، ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے معاملات کو صحیح شکل میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ عین ان سطروں کی تحریر کے وقت ہندوستان کے پرانے سیاست داں راجہ جی کی ایک تقریر کا خلاصہ اخبارات میں شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے یہ فرمایا ہے کہ "کلچر کو ایک کرنے کی بات بنیادی طور پر غلط ہے، مصنوعی اتحاد کو حسن اور کلچر نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ اسے ایک قسم کی سیاست کا نام ضرور دیا جاسکتا ہے"۔ انھوں نے اپنی اس تقریر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ

"ہمیں ترکیب اور ترتیب کے لئے قدرت کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے اور مصنوعی دباؤ کے ذریعہ ترکیبی عمل پر زور نہ ڈالنا چاہیئے، یہی ترقی پسند انقلاب کی بنیاد ہے"۔

ان باتوں پر غور کیجئے، کتنی حقیقت پسندانہ ہیں! بہرحال ہمارے نزدیک اس وقت مسلمان جس اضطراب اور پریشانی کا شکار ہیں وہ کچھ بے وجہ نہیں ہے اور اس کے نتیجہ میں اگر وہ اپنی قدیم روش سے ہٹ کر کچھ نئی راہیں تلاش کرنے کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں تو یہ بھی کوئی غلط کام نہیں ہے بلکہ ایک خود دار اور غیرت مند ملت ہونے کی بنا پر یہ

ایک طرح سے ان کا ایک ضروری فرض تھا، اس لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ایک عرصہ کے جمود و سراسیمگی یا خوابِ غفلت کے بعد، ان کی بیداری کی یہ ایک علامت ظاہر ہوئی ہے۔

ضرورت احتیاط

لیکن جہاں ہم ان کی اس نئی بیداری کو مبارک اور ان کے مستقبل کے لئے ایک فالِ نیک سمجھتے ہیں وہیں ہمیں کچھ یہ اندیشہ بھی ہو رہا ہے کہ خدانخواستہ یہ بیداری کہیں خوابِ غفلت کی ایک کروٹ ثابت نہ ہو یا آگے جو قدم اٹھایا جا رہا ہو اس پر اب بھی نیم غنودگی ہی کا کچھ سایہ ہو۔ اس لئے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جس طرح اس سے پہلے ہم نے اس طبقہ کے خیالات و رجحانات پر تنقید کی ہے جو ہمارے نزدیک کچھ بیدار ہونے پر بھی ابھی دورِ غفلت و مرعوبیت کے کچھ باقیات السیئات سے چمٹا ہوا ہے اور جن کے ساتھ یہ بیداری بڑی حد تک بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے، اسی طرح ایسے رجحانات کو بھی زیرِ بحث لائیں جن کی بنا پر اس بیداری کے غلط رخ پر پڑ جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو احتیاط کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی نیا قدم اٹھانا ہی سرے سے مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم افراد کی طرح قوموں، ملتوں اور گروہوں کے بارے میں بھی یہ تصور رکھتے ہیں کہ انھیں کبھی کبھی کچھ خطرات بھی مول لینے پڑتے ہیں اور اسی سے ان میں جان پیدا ہوتی ہے اور ہم اس کے بھی قائل ہیں کہ زندگی کی کامیابیوں کی طرح اس کی ناکامیاں بھی افراد اور اقوام و ملل کی ترقی کا زینہ بنتی ہیں لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات بہرحال اس کے متقاضی ہیں کہ عام حالات میں عشق کو عقل کی پاسبانی سے بالکل آزاد نہ چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس سے جو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں وہ اپنی ذات یا کسی مخصوص گروہ تک محدود ہو کر نہیں رہ سکتے بلکہ پوری ملت اور اس کے ساتھ ملک کے مفادات بھی اس کی زد میں آسکتے ہیں۔

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے بارے میں خدانخواستہ ہم کسی سوء ظن میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس ہم نے بارہا اس پہلو سے انھیں سراہا ہے کہ انھوں نے اپنی مجموعی حیثیت میں حالات اور ان کے تقاضوں کے سمجھنے میں کافی سوجھ بوجھ کا ثبوت پیش کیا ہے لیکن پھر بھی اگر ہم ان کی اس نئی بیداری کے آئندہ رخوں کو قابلِ توجہ قرار دے رہے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اپنے خیال کے مطابق یہ بیداری اپنے صحیح رخ سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس کے اسباب و محرکات میں وہ محرک مفقود ہے یا اگر ہے تو اس کا اثر بس برائے نام ہی ہے جو امتِ مسلمہ کی بیداری کا حقیقی محرک کہلانے کا مستحق ہے یعنی اپنے اصل منصب و مقام کا شعور اور اس مقام سے گر جانے کا احساس اور اس پر جذبۂ افسوس و ندامت۔ اس نئی بیداری کا اصل محرک درحقیقت وہ اضطراب و بے چینی ہی ہے جو یہاں کے حالات نے ان کے اندر پیدا کر دی ہے اور ان میں بھی وہ حالات خاص طور سے اس کے موجب بن رہے ہیں جو ان کی عزت و خودداری کو مجروح یا ان کے وجود و بقا اور ان کی معاشی حالت کو متاثر کرنے والے ہیں اس لئے اگر یہ بات صحیح ہے کہ ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

تو اسے کچھ بعید قرار نہیں دیا جا سکتا کہ یہ اضطراب اور بے چینی کہیں کہیں حدود کی پابند نہ رہ سکے اور اس سے ملت کو خدانخواستہ فائدہ کے بجائے نقصان پہنچ جائے۔

اپنے اسی احساس کے تحت چند باتیں ہم یہاں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ایجی ٹیشن مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی تو پہلے ہی سے موجود تھی لیکن دو خاص واقعات وقتی طور سے ان میں مزید ہیجان کے موجب بن گئے ہیں۔ ایک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ساتھ حکومت کا رویہ جس پر پورے ہندوستان کے مسلمانوں نے یوم دعا منا کر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا لیکن حکومت ٹس سے مس نہیں ہوئی اور دوسرا جنگ کے موقع پر

ان کی اندھا دھند گرفتاریاں۔ اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ واقعات اس وقت پیش آئے ہیں جب الیکشن سر پر آگیا ہے اور ایک طرح سے اس کا بگل بھی بج چکا ہے۔ اس لئے قدرتاً ان کا ذہن اس طرف مائل ہو گیا ہے کہ الیکشن کو اپنی شکایات کے ازالہ کا ذریعہ بنانا چاہیے۔

ہمارے نزدیک اصولاً اس میں کوئی غلطی نہیں ہے ہم خود اس سے پہلے الیکشن کی اہمیت پر پورا زور دے چکے ہیں اور اس سے مسلمانوں کی بے تعلقی کو ان کے لئے مضر اور نقصان دہ بھی قرار دے چکے ہیں اور یوں بھی جب مسلمان یہاں کے باقاعدہ شہری ہیں اور اس حیثیت سے انہیں اپنا ووٹ اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ تو اسے اپنی جائز خواہشات کے حصول کے لئے کیوں نہ استعمال کریں۔ لیکن اصل سوال درحقیقت اس کا ہے کہ بحالات موجودہ وہ الیکشن سے فائدہ کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم اپنا یہ خیال پہلے ہی پیش کر چکے ہیں کہ ہندوستان اور خود مسلمانوں کے اپنے حالات کے پیش نظر کم از کم فی الحال اس کا کوئی موقع نہیں ہے کہ ان کی کوئی الگ سیاسی پارٹی قائم ہو جو الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کرے۔ جداگانہ طریقِ انتخاب کے بجائے مخلوط طریقِ انتخاب کا رائج ہونا بجائے خود ایک بڑی رکاوٹ ہے اور اس پر مستزاد یہ بات کہ وہ بجائے خود منظم نہیں ہیں اور ان میں ایک بڑی تعداد میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ان کی کسی تنظیم کا نام سنتے ہی پنجے جھاڑ کر نام لینے والوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اپنے اس کارنامہ کی داد اوروں سے تو خیر وصول کرتے ہی ہیں، اپنوں سے بھی اس پر داد پانے کے منتظر رہتے ہیں اور کم از کم ان کی طرف سے ان کو کسی ملامت اور سرزنش کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ خود ان میں بھی سر اونچا کئے دندناتے پھرتے ہیں۔

اسی طرح بحالاتِ موجودہ کسی سیاسی پارٹی سے کوئی سمجھوتہ کر کے اپنے ووٹوں کو کارآمد بنانے کا مسئلہ بھی کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں جو عملی سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو حل کئے بغیر اس پر کہاں تک تکیہ و اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ لے دے کر یہی ایک آسان صورت باقی رہتی ہے کہ

مسلمان کانگریس کی مخالف پارٹیوں میں شریک ہو کر ان کے ذریعہ اپنا کام نکالنے کی کوشش کریں، تو اگر کسی کا نقطہ نظر یہ ہو کہ ہمیں کانگریس کے خلاف اپنا غصہ نکالنا ہے اور ملت کی خود اپنی شیرازہ بندی اس کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تو اس کے لئے تو یہ راستہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ملت کی شیرازہ بندی کی بھی کچھ اہمیت ہے اور اس سے بڑی بات یہ کہ اس ملت کو بہ حیثیت ملت اپنی کچھ ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں تو پھر تو اس پر یہاں کوئی تفصیلی بات کرنے کی بجائے صرف اتنا عرض کر دینا کافی خیال کرتے ہیں کہ اس نقطہ نظر کے حامیوں کو "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" کی مثل بہرحال اپنے سامنے رکھنی چاہیئے۔ ہمارے اپنے خیال کے مطابق اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ برآمد نہیں ہو سکتا کہ خدا نخواستہ آئندہ تھوڑے دنوں بعد اسلام کے حقیقی مخلصین کو حسرت و اندوہ کے ساتھ یہ دہرانا پڑے ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہمارا خیال ہے کہ جن مشکلات کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ان کا احساس کم و بیش ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کو ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں جو اضطراب اور بے چینی بالکل جائز وجوہ سے ان کے اندر پیدا ہو چکی ہے۔ وہ ان کو کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے بھی بے چین کئے ہوئے ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ موانع راہ کو خاطر میں لانے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہیں اور راہ و منزل کے کسی واضح تصور کئے بغیر کسی نہ کسی سمت میں چل پڑنا چاہتے ہیں اور ان میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جن کے اضطراب و بے چینی میں اس سے اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے کہ اسے دور کرنے کی انھیں کوئی فوری مؤثر تدبیر نظر نہیں آتی اس کا نتیجہ کہیں کہیں حکومت اور اکثریت کے خلاف تلخ گفتاری کی شکل میں بھی نمایاں ہو رہا ہے حالانکہ یہ ظاہر بات ہے کہ اس سے دل کی بھڑاس تو کچھ نکل سکتی ہے لیکن اصل دکھ کا یہ کوئی مداوا نہیں ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کانگریس کا اقتدار ختم یا کمزور ہونا چاہیئے ان کی بات آسانی سے رد کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ پریشان حال مسلمانوں کے لئے تو یہ دلیل کافی ہو سکتی ہے کہ کانگریس کے اقتدار کو قائم رکھنے میں خود ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے لیکن پھر بھی وہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکی لیکن ملک کے مجموعی نفع و نقصان کے پہلو سے بھی اس بات میں خاصا وزن محسوس کیا جاسکتا ہے یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آزادی کے بعد مسلسل برسر اقتدار رہنے کی وجہ سے کانگریس میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں بہت سے لوگ محض وزارت اور ممبری کے لالچ میں یا اپنے دوسرے حقیر مفادات حاصل کرنے کے لئے اس میں گھس گئے ہیں۔ اور اس طرح یہ جماعت ایک اصولی جماعت ہونے کی بجائے بڑی حد تک محض مفاد پرستوں کی جماعت بن کر رہ گئی ہے۔ اور اسی کی بنا پر اس پر ایک طرح کا طاقت کا نشہ بھی سوار ہو چکا ہے جس سے مدہوش ہو کر وہ بعض اوقات جمہوریت کے ابتدائی تقاضوں کو بھی پامال کرتی رہتی ہے اور اس کا نقصان ملک کو اس شکل میں بھی اٹھانا پڑ رہا ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، مخالف پارٹیوں کی بہت سی بے راہ رویاں براہ راست ان کی اس جھنجھلاہٹ کا نتیجہ ہیں کہ ان کو جلد ملک کے نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس طور سے جمہوریت اور ملک کے مفاد کو خود مخالف پارٹیوں کے طرز عمل سے جو خطرہ پیش آچکا ہے وہ بھی کانگریس کے مسلسل برسر اقتدار رہنے ہی کا ایک نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

غرض یہ اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں کانگریس کو ناکام یا کمزور بنانے کے لئے بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہیں اور ان میں ہم اور آپ سب ہی بہت کچھ وزن محسوس کر سکتے ہیں لیکن یہاں پھر وہی سوال عملی اقدام کا آتا ہے کہ مسلمان بحالات موجودہ اس سلسلہ میں کیا کر سکتے ہیں اور وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ بہ حیثیت ملت کہاں تک ان کے لئے مفید ہوگا۔ یہاں پھر ان باتوں کو ذہن میں تازہ کر لیا جائے۔ جن کی طرف اس

سے پہلے ہم عملی دشواریوں کے ذیل میں اشارہ کر چکے ہیں۔ ہمیں اپنی رائے پر کوئی اصرار نہیں ہے لیکن حالات نے مسلمانوں کو جس مقام پر پہنچا دیا ہے، ہمارے خیال میں اس کی رعایت بلحوظ رکھنا ان کے لئے ضروری ہے اور اس کی رو سے وہ دوسری پارٹیوں کی ان کوششوں کو جو وہ کانگریس کو ختم یا کمزور کرنے کے لئے عمل میں لا رہی ہیں۔ مذکورہ بالا فوائد کے پیش نظر شاید سراہ تو سکتے ہیں لیکن اس معاملہ میں کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے انھیں یہ اچھی طرح غور کرنا ہوگا کہ ان کے اپنے مخصوص فائدہ و نقصان کے نقطۂ نظر سے وہ ان میں کہاں تک ان کی شریک ہو سکتی ہیں۔ اچھا ہوگا کہ اس موقع پر ہمارا وہ جائزہ بھی سامنے رکھ لیا جائے جو شروع . . . میں الیکشن کے متوقع نتائج کے ذیل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ آپ کے لئے اس سے اتفاق ضروری نہیں ہے لیکن غور کرتے وقت ایک اور نقطۂ خیال کو سامنے رکھنا بہر حال مفید ہی ہوگا۔

مسلم مجلس مشاورت

ہماری یہ گفتگو اب جس مرحلہ پر پہنچی ہے اس میں مسلم مجلس مشاورت کا تصور اس موقع پر کسی کے ذہن میں ابھرے تو یہ کوئی غیر متوقع بات نہ ہوگی۔ بہت سے لوگوں نے یہ خیال قائم کر لیا ہے کہ مسلم مجلس مشاورت سیاست میں کوئی سرگرم حصہ لینے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو عملی مشکلات اور دشواریاں ہیں ان کو وہ اپنے طور سے کسی نہ کسی طرح حل کر چکی ہے اور اسی کے مطابق وہ الیکشن میں مسلمانوں کو رہنمائی دینا چاہتی ہے، خاص طور سے اس بارے میں کہ وہ آئندہ الیکشن میں کس پارٹی کا ساتھ دیں۔ مسلم مجلس مشاورت کے ساتھ مسلمانوں کے حسن ظن کا تو میں دل سے خیر مقدم کروں گا، لیکن میرے اپنے خیال کے مطابق اس کے بارے میں کوئی ایسی رائے قائم کر لینا جو واقعہ کے خلاف ہو نہ مجلس کے لئے مفید ہو سکتی ہے، اور نہ رائے قائم کرنے والوں کے لئے۔ اس لئے میں نے مجلس یا اس کے موجودہ یا آئندہ فیصلہ کے متعلق جو کچھ سمجھا ہے اسے یہاں صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

میں اس خواہش میں کسی سے پیچھے نہیں ہوں کہ مجلس مسلمانوں کا ایک واقعی مستحکم وفاق بنے جو خود الیکشن کے بارے میں مسلمانوں کی پوری رہنمائی کر سکے کہ انھیں ملک و ملت کے مفاد کے لئے کیا کرنا ہے لیکن اس بارے میں کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ابھی اس طرح کا کوئی وفاق وجود میں نہیں آسکا ہے اور مجلس مشاورت کے نام سے جو تنظیم وجود میں آئی ہے وہ مسلمانوں کی بہترین خواہشات اور تمناؤں کے باوجود ابھی اپنے استحکام کی نہایت ابتدائی منزلیں طے کر رہی ہے اور ساتھ ہی خود مسلمانوں ہی کے مختلف گروہوں کی طرف سے اس میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آرہی ہیں۔ ایسی حالت میں میرے اپنے اندازہ کے مطابق وہ اگر چاہے بھی تو الیکشن کے بارے میں وہ خود دور تک جانے کا کوئی فیصلہ کر سکتی ہے اور نہ اس بارے میں مسلمانوں ہی کو کوئی بڑا مشورہ دے سکتی ہے پھر میرا اپنا احساس یہ بھی ہے کہ مجلس نے جن مقاصد کو اہمیت دی ہے خود ان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ حتی الوسع الیکشن کی عملی سرگرمیوں میں اپنے کو نہ ڈالے ان سے بہر حال وہ مقاصد متاثر ہو سکتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ مجلس کے ذمہ داروں کا عام احساس بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ اور اس کے منشور سے بھی یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ بھی وہ اپنے پیش نظر مقاصد ہی کے لئے ایک بہتر فضا پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس کے مقاصد کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ وہ ایک طرف مسلمانوں میں اپنے خیر امت ہونے کا احساس پیدا کر کے انھیں اس کے تقاضے پورا کرنے پر آمادہ کرنا چاہتی ہے۔ اور دوسری طرف وہ ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد و یک جہتی کی فضا قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے جو مسلمانوں کے خود اپنے نقطۂ نظر سے بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اور یہ دونوں باتیں اس منشور میں بھی پوری طرح مدنظر رکھی گئی ہیں۔ منشور کے کچھ نکات کے بارے میں گفتگو ہو سکتی ہے کہ ان کو اس میں جگہ دینا کہاں تک مناسب ہے لیکن بہ حیثیتِ مجموعی وہ بہر حال ملک و ملت دونوں کے لئے مناسب ہی کہے جا سکتے ہیں

اور ہمیں پوری توقع ہے کہ آئندہ مجلس جو کچھ بھی فیصلہ کرے گی وہ اس کے بنیادی اندازِ فکر سے کوئی بے جوڑ بات نہ ہوگی۔ اس لئے نہ مجلس کے مخالفین کو اس کے بارے میں خواہ مخواہ اندیشوں میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہے اور نہ اس کے بہی خواہوں کو اس کے بارے میں کوئی ایسی توقع قائم کر لینی چاہیے جسے پورا کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہو اور اگر وہ اسے پورا کرنا چاہے تو اس کے جو اصل بنیادی مقاصد ہیں اور جن سے ہر مسلمان کو پوری ہمدردی ہونی چاہیے، اس سے متاثر ہو جائیں۔ ہاں مسلمانوں کو یہ ضرور چاہیئے کہ مجلس کی خواہش کے مطابق منشور کے نکات کو گھر گھر پہنچانے کی کوشش کریں تاکہ ان نکات کے حق میں ملک میں سازگار ماحول پیدا ہو سکے۔ اس سلسلہ میں وہ جو کوششیں کریں گے ان سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی کتنی قوت مجلس کے ساتھ ہے، اس سے انشاء اللہ ان کے اپنے مسائل کے حل میں ضرور مدد ملے گی۔ اور منشور کی زیادہ سے زیادہ اشاعت مسلمانوں میں ملی شعور و احساس پیدا کرنے کی بھی موجب ہو سکتی ہے، اور اس سے بھی ملت کو بہت سے طریقوں سے بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

مشکلات کا صحیح حل

اوپر کی تفصیل سے یہ بات نمایاں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت سخت ترین حالات سے دوچار ہیں ایک طرف ان کی مشکلات اور پریشانیاں ہیں جن کا وہ کوئی نہ کوئی حل نکالنا چاہتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ جادھر بھی نگاہ اٹھاتے ہیں انھیں راستہ پُرخطر اور دشوار نظر آتا ہے اور اس نے ان کی پریشانیوں میں ایک اور بڑی پریشانی کا اضافہ کر دیا ہے، وہ تو کہیے کہ یہ نہایت سخت جان ملت ہے اور جس دین کا دامن اس نے جس حد تک بھی تھام رکھا ہے وہ اپنے نام لیواؤں کو سنبھال رکھنے کی بڑی غیر معمولی قوت رکھتا ہے ورنہ ایسے حالات میں مبتلا ہونے پر کچھ بعید نہیں تھا کہ ان کے مقابلہ و مزاحمت کی طاقت ہمیشہ کے لئے جواب دے دیتی اور وہ اپنے کو خدا نخواستہ تمام تر حالات کے حوالہ کر دیتے کہ جس رُخ پر انھیں وہ پھینکنا

چاہیں پھینک دیں مگر پھر بھی آخر کب تک وہ ان کے مقابلہ کی تاب لا سکیں گے؟ ان حالات سے بہر حال جلد از جلد انھیں چھٹکارا حاصل ہونا چاہیئے ورنہ ابھی تو تھوڑے سے لوگوں کی کمزوریاں سامنے آئی ہیں اور ہم ان پر آنسو بہانے بیٹھ جاتے ہیں۔ خدا معلوم کل کتنے اور ان ہی راستوں پر چل پڑیں گے اور یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا۔ لاقدر اللہ۔

مایوسی یوں بھی کفر ہے اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اس کے برعکس دونوں کا مستقبل نہایت شاندار ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی موجودہ مشکلات و مسائل کا کوئی فوری اور وقتی حل تلاش کر کے صرف اس پر تکیہ نہ کرلیں بلکہ ان کا مستقل حل جس کی رہنمائی خود ان کا دین کر رہا ہو، معلوم کریں اور پھر اسے پورے عزم اور مضبوطی کے ساتھ اختیار کریں اور ہو سکے تو اپنے دین ہی کی روشنی میں اپنی موجودہ حالت تک پہنچنے کے اسباب کی بھی تحقیق کریں۔ اس سے آئندہ کے لئے انھیں بہت کچھ سبق حاصل ہو سکتا ہے۔

جہاں تک ہم نے مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل پر غور کیا ہے اس وقت اس پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے البتہ اس سلسلہ میں چند باتیں بطور خلاصہ ہم یہاں عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۔ یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ مسلمانوں کے اپنے جو مخصوص مسائل ہیں ان کے حل کے لئے الیکشن کو ذریعہ بنانے کے ہم اصولاً مخالف نہیں ہیں اور مخالف ہو بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ خود ہمارا اپنا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہم نے اقامتِ دین کے جس مقصد کو اپنایا ہے اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے کہ اسلام قولی و عملی شہادت کے ساتھ مؤثر طور پر غیر مسلموں کے سامنے آسکے، اور ظاہر ہے یہ ضرورت اسی طرح پوری ہو سکتی ہے کہ امتِ مسلمہ ایک داعی گروہ کے موقف میں کھڑی ہو سکے اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی تمام ملی خصوصیات کے ساتھ محفوظ و مامون رہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر ہم نے بطور پالیسی یہ طے

کر رکھا ہے کہ امتِ مسلمہ کی بقا و تحفظ اور اس کی خصوصیات کو قائم و برقرار رکھنے، نیز مستحکم کرنے کے لیے بھی ہمیں کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ اور مذکورہ بالا مقصد کے لیے اس طرح کی تمام کوششیں ایک طرح سے اقامت دین ہی کے مفہوم میں شامل سمجھی جا سکتی ہیں۔

اسی طرح ہم الیکشن کی اہمیت کے بھی منکر نہیں ہیں بلکہ ہم اپنے بارے میں بھی طے کر چکے ہیں کہ ہمارے حالات سازگار ہوں تو اسلام اور مسلمانوں کے اہم تر مفادات کے لئے ہم خود بھی الیکشن میں حصہ لے سکتے ہیں۔

لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ہم مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس وقت جہاں الیکشن میں اپنے ووٹ کو کارآمد بنانے اور اس کی شکلوں پر غور و فکر کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں وہیں وہ اس پر بھی توجہ دیں کہ ان مسائل کے حل کرنے کی اور دیگر کیا تدابیر ہو سکتی ہیں۔ الیکشن کی اہمیت جو کچھ بھی ہو یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کے مسائل کے حل کا وہی واحد ذریعہ ہے بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ الیکشن کو ان کے حل کا ذریعہ بھی اسی وقت بنایا جا سکتا ہے جب اس سلسلہ میں پہلے سے بہت کچھ کام کر کے حالات کو سازگار بنایا جا چکا ہو۔ اس کے بغیر تو الیکشن کی چیخ و پکار اور اس سلسلہ کی دوڑ دھوپ محض بے معنی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے کام جن سے حکومت سے بے نیاز ہو کر بھی مسلمان اپنی حالت بہتر بنا سکیں یا ان میں وہ جان پیدا ہو کہ دوسرے بھی ان کو وزن دینے پر اپنے کو مجبور پائیں ایک دو نہیں، سینکڑوں ہیں اور وہ کسی کے بتائے بغیر خود ان کو معلوم کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ کچھ کرنا بھی چاہیں۔

۲۔ الیکشن کے موقع پر مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم کی ضرورت کا ہر طرف سے اظہار ہو رہا ہے اور یہ ایک طرح سے ایک متوقع سی بات ہے کیونکہ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں الیکشن کے ضمن میں مسلمانوں کو جن عملی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کا حل درحقیقت ان کی تنظیم ہی ہے لیکن یہ سوچنا خام خیالی ہوگی کہ خطرات کے مشترک احساس نے طبیعتوں

میں جنبش پیدا کر کے تھوڑے یا زیادہ لوگوں کو اکٹھا کر دیا ہو تو یہ ان کے متحد ہوجانے کے ہم معنی بن گیا اور ایسا اتحاد کسی معمولی آزمائش سے دوچار ہونے پر بھی قائم و برقرار رہ سکتا ہے۔ جب تک ان کے درمیان کوئی خاص کلمۂ جامعہ نہ ہو اور ان کا جذبۂ اتحاد کسی منفی بات کی بجائے کسی مثبت، ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر قائم نہ ہو، یہ اتحاد ایک مصنوعی اتحاد ہوگا اور تا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔

۲۔ مسلمانوں کے اصل منصب و مقام کے لحاظ سے ان کی تنظیم کی بنیاد محض اسلام اور اس کے مفادات ہی ہو سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کے وہ حقوق و مفادات جو ان کی اس حیثیت کو برقرار رکھنے یا اس حیثیت میں اپنا فرض انجام دینے کے لئے ضروری ہوں اور ہم یہاں صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک تقسیم سے پہلے یا اس کے بعد مسلمانوں کے جتنے بھی مسائل پیدا ہوتے وہ دراصل اس بات کی پیداوار ہیں کہ انھوں نے اپنا فرض منصبی ادا کرنے سے غفلت برتی اور ان راہوں پر چل پڑے جو وقتی حالات و مصالح کے لحاظ سے انھیں ضروری معلوم ہوئے لیکن درحقیقت ان کے اصل منصب سے کوئی میل نہیں کھاتے تھے۔ ان طریقوں میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ حکومت و اقتدار سے محروم ہوجانے کے بعد بجائے اس کے کہ ہوش میں آتے اور اپنا اصل مقام اور حیثیت پہچان کر اسے پوری مضبوطی سے اپنانے کی کوشش کرتے انھوں نے بھی اپنے کو دوسری قوموں کی طرح ایک قوم سمجھا اور اس حیثیت سے اپنی حالت دیکھی تو بہت سی سمتوں سے انھیں اپنے وجود اور اپنے مفادات و حقوق کے لئے خطرے نظر آئے جس کا علاج قومی نقطہ نظر سے ظاہر ہے یہی ہو سکتا تھا اور اس حیثیت میں وہ غلط بھی نہ تھا کہ وہ اپنے کو قومی لائنوں پر زیادہ سے زیادہ منظم کر کے ان لوگوں سے کش مکش و مقابلہ کریں جن کی طرف سے وہ خطرے درپیش تھے۔ ان کی ماضی قریب کی تاریخ آپ دیکھیں تو بڑی حد تک اسی کش مکش و مزاحمت کی داستان معلوم ہوگی جو بالآخر اس پر جا کر ختم ہوئی کہ ہندوستان کی تقسیم

کے ساتھ ان کا جسدِ ملی بھی دو کیا تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور پھر بھی جن مسائل کو اہمیت دی جا رہی تھی وہ جوں کے توں قائم رہے بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن بن گئے کیونکہ اس تقسیم نے ایک طرف تو مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی اور دوسری طرف اس نے پورے ملک کے ماحول کو ان کے لئے نہایت درجہ زہر آلود بنا دیا یہ نقصان تو انھیں اپنے اصل مسائل کے سلسلہ میں اٹھانا پڑا اور اس سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ ان کے اس طرز عمل سے اسلام کا نہایت غلط تعارف ہوا اور یہاں کے غیر مسلم اس سے پہلے سے کہیں زیادہ دور ہو گئے۔

ان نتائج کو دیکھ لینے کے بعد اب خوب سوچ سمجھ کر اس راستہ کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دینے کا فیصلہ کر لینا چاہیئے اور اس کے بجائے اپنی تنظیم کی بنیاد خالص اسلام کو قرار دینا چاہیئے جو کتاب و سنت کی واضح ہدایات کے مطابق ہمارا فرض بھی ہے اور اسی سے ان کا اتحاد ایک حقیقی اور پائیدار اساس پر قائم ہو سکتا ہے اور ان میں وہ جذبہ و روح پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک طرف وہ اپنے اندرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل کرنے کے قابل بن سکیں اور دوسری طرف وہ بیرونی خطرات کے مقابلہ کے لئے بنیانِ مرصوص ثابت ہوں۔ اس مقصد کے لئے ایک ٹھوس پروگرام بنا کر اس کے مطابق کام کرنے کی ضرورت ہو گی اور اس میں سب سے مقدم کام یہ ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں میں رجوع الی اللہ کا جذبہ پیدا کیا جائے اور انھیں اس بات پر پوری طرح مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے کہ ان کی دنیوی و اخروی کامیابی اور نجات کا دار و مدار تمام تر اسلام پر ہے نہ کہ ان نظام ہائے زندگی پر جن کا اس زمانہ میں چلن ہے اور جن میں سے کچھ تو اسلام کی اساسی باتوں سے وجود خدا، آخرت اور رسالت وغیرہ کی نفی پر قائم ہیں اور کچھ ان سے سروکار تو نہیں رکھتے لیکن اپنے عملی نتائج کے اعتبار سے مقدم الذکر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ اور اگر ان دونوں میں بعض پہلو سے کچھ خوبیاں پائی

بھی جاتی ہیں تو اپنے بنیادی نقائص اور بحیثیتِ مجموعی اپنی خرابیوں کی بنا پر مسلمانوں کے لئے کسی حال میں بھی قابلِ اختیار نہیں ہو سکتے"۔ جب کہ ان کے پاس اسلام کی شکل میں ایک ایسا نظامِ زندگی موجود ہے جو نہایت جامع اور کامل بھی ہے اور ہر طرح کے نقائص سے پاک بھی۔ بس اصل ضرورت اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہے۔

۴۔ اسلام کی بنیاد پر مسلمانوں کی تنظیم کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ان کی دلچسپی بس اپنوں اور اپنے مسائل تک محدود ہو کر رہ جائے۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے وہ تمام دنیا کی رہنمائی و ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے۔ وہ تمام بنی نوع انسان کو ایک آدمؑ اور حواؑ کی اولاد قرار دے کر، رنگ و نسل اور قوم و ملک کے کسی امتیاز کے بغیر خدا ترسی اور ایک دوسرے کی اخوت اور بھائی چارگی کی بنیاد پر ایک عالمگیر معاشرہ وجود میں لانا چاہتا ہے اور مسلمان جو اس دین کے امین و حامل بنائے گئے ہیں وہ کسی مخصوص گروہ کے اغراض و مقاصد کے محافظ و نگراں نہیں بنائے گئے ہیں بلکہ اس کی بجائے وہ پورے نوعِ انسانی کے خادم و مصلح قرار دیے گئے ہیں۔ جیسا کہ آیت کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ کے لفظ "للناس" کے عموم اور امر و نہی کے غیر مقید اور غیر محدود انداز سے واضح ہوتا ہے۔ اس بنا پر از خود ان کا دائرہ کار بھی اپنی اصل کے لحاظ سے اپنے اندر اتنی وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے کہ ملک تو ملک پوری دنیا اس کے احاطے میں شامل ہو سکتی ہے۔

۵۔ آخری بات جو ہم اس سلسلہ میں عرض کرنی چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان کے مقصد و نصب العین اور ان کے صحیح منصب و مقام کی جو تشریح ابھی آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اس کے مطابق عمل پیرا ہونے کا جلد قطعی فیصلہ کریں۔ ہندوستان اس وقت جن نازک حالات

سے گذر رہا ہے اور خود الیکشن کے نتیجہ میں جو حالات پیدا ہو چکے ہیں ان پر ہم اپنے مضمون کی ابتدا ر میں تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ مسلمان بہر حال اس ملک کے شہری ہیں اور ملک کے اچھے برُے حالات کا ان پر بھی اثر پڑنا ناگزیر ہے اس لئے ملکی حالات کی اصلاح و درستگی کی کوشش ایک دینی فرض کی ادائگی کے ساتھ شہری ہونے کا تقاضا پورا کرنے اور اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کے پہلو سے بھی ضروری ہے۔

حالات کی جو تفصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے، اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو رہی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ خرابیوں میں سب سے بڑی خرابی وہ شدید اخلاقی بحران ہے جس میں یہاں کے عوام و خواص بری طرح مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ بحران درحقیقت اس بات کا نتیجہ ہے کہ مذہب جو اخلاق کا اصل سرچشمہ ہے اس کی گرفت زندگی پر سے ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ ان افکار و نظریات نے لے لی ہے جو انسان کے ظاہر کو تو تہذیب کی زیب و زینت سے آراستہ کر دیتے ہیں۔ لیکن باطن کے لحاظ سے اسے حرص و آز اور ہوس زر و اقتدار کا بندہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ جمہوریت اس معنی میں بڑی اچھی چیز ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لیتا ہے لیکن مغرب سے ہمیں جس جمہوریت کا تحفہ ملا ہے وہ انسانوں کو صرف اس غلامی ہی سے نجات نہیں دلاتی بلکہ اسے اس مقام پر لا کھڑا کرتی ہے، جہاں وہ اپنے کو ہر طرح آزاد اور خود مختار سمجھ کر اور خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر محض اپنی عقل و تجربہ کی روشنی میں ہر طرح کی من مانی کرنے لگتا ہے۔ اور ظاہر ہے اس کے بعد یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے کہ جو لوگ اقتدار پر قابض ہوں وہ اپنے ذاتی مفادات کو چھوڑ کر دوسروں کے راحت و آسائش سے غرض و دلچسپی رکھیں۔ اور جو لوگ اس سے محروم ہوں وہ اسے حاصل

کرنے کے لئے ان طریقوں کو اختیار کرنے سے باز رہیں جن کے ذریعہ وہ اسے حاصل کر سکتے ہوں، خواہ وہ طریقے بجائے خود پورے قوم و ملک کے لئے تباہ کن ہی کیوں نہ ہوں۔ پس وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ملک کو اس بحران سے نجات دلانا ہے اور یہ کام مسلمان ہی زیادہ بہتر طور سے انجام دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس وہ مشعل ہدایت ہے جو ان حالات میں پوری پوری رہنما ثابت ہو سکتی ہے اور وہ اپنی اس گئی گذری حالت میں بھی اس طرح کی بہت سی خرابیوں سے محفوظ بھی ہیں۔ اصلاح کا یہ کام منظم جد وجہد کا طالب ہے۔ اس لئے ان کی تنظیم کا مقصد مسلمانوں کی اپنی اصلاح کے ساتھ پورے ملک کی اصلاح بھی ہونا چاہیئے اور اس کے لئے وہ تیار ہوں تو عہد حاضر کی جمہوریت کو اس کی بنیادی خرابی سے پاک کرنے کے لئے خود الیکشن کو بھی اس کی اصلاح کا ایک ذریعہ بنا سکتے ہیں، اور ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مذہب و اخلاق کی قدر و قیمت ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور ساتھ ہی جمہوریت کی موجودہ شکل سے شعوری اور غیر شعوری طور سے کچھ نہ کچھ بے اطمینانی بھی پائی جاتی ہے یہ کام بہت زیادہ دشوار نہیں ہے البتہ اس کے لئے ناگزیر حد تک رائے عامہ کی تربیت بہرحال ایک ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری رہنمائی فرمائے اور اس کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے ہماری مشکلات دور فرما دے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

ہماری مطبوعات

پردہ ۵/-		دعوتِ دین ۳/-
رسالۂ دینیات ۱/۵	خطبات اوّل تا پنجم ۲/۳۳	قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ۱/۵۰
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر ۱/-	تجدید و احیائے دین ۱/۵	تفہیمات اوّل ۵/۵ تفہیمات دوم ۵/۰
فریضۂ اقامتِ دین ۱/۰	اساسِ دین کی تعمیر ۳/۵۰	اسلام — ایک نظر میں! ۰/۵
انسان اور اسکے مسائل ۱/۰	اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ ۱/۷۵	عورت اسلامی معاشرے میں ۳/-
تنقیحات ۳/-	حقیقتِ نفاق ۱/۵۰ حقیقتِ شرک ۲/-	حقوق الزوجین ۱/۵۰

مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند سوئیوالان دہلی ۶

رفِ نامیشل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا